قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اگست 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



طلوعِ اسلام کے قارئین کو
جشنِ آزادی مبارک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

اگست 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 08

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: 14 اگست کا پیغام	ادارہ	4
اسلام میں ''فکر'' کی گنجائش	غلام احمد پرویزؒ	5
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی	عنایت اللہ	11
نماز کیسے پڑھی جائے؟	ملک منظور حسین لیل بھکر	18
وہ غیر مسلم جو اچھے کام کرتے ہیں کیا وہ جنت میں جائیں گے؟	خواجہ ازہر عباس، کراچی	28
دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	35
نوجوانوں کا صفحہ: نخل سینا، نشست نمبر 8	محمد علی صابر صدیقی	46
بچوں کا صفحہ: قرآن مجید سمجھ کر پڑھنا چاہئے	ادارہ	54
''اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' کی قرآنی تفسیر	ڈاکٹر شاکر حسین خان، کراچی	56

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل) Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) – Message to Fellow-Seekers** **By G. A. Parwez , Translated by: M. Alam**	**60**
Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)** **We are also Muslims like other Muslims** **By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)**	**63**

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبت مرغِ چمن کب تک!
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہین قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ المانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تورانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال وپرِ رُوح الامیں پیدا

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

14 اگست کا پیغام

شام کے سفر سے واپسی پر، حضرت عمرؓ نے دور و دراز وادی میں ایک خیمہ دیکھا۔ حسب معمول آپ تحقیق احوال کے لئے خیمہ میں گئے تو وہاں ایک بڑھیا نظر آئی۔ بغیر بتائے کہ آپ کون ہیں، اس سے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ اس نے شکایت کی کہ حکومت کی طرف سے اس کی خبر گیری نہیں ہو رہی جس کی وجہ سے اسے تکلیف ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے حکومت تک اپنی تکلیف کی اطلاع بھی پہنچائی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ یعنی اطلاع نہیں پہنچائی۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی اور کہا کہ جب تم نے اطلاع نہیں پہنچائی تو پھر خلیفہ کو اتنی دور سے تمہارا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟ بڑھیا نے کہا کہ:

جب عمرؓ کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو پھر خلافت کیوں کرتا ہے؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو اکثر دہرایا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ مجھے اس حقیقت سے اس بڑھیا نے باخبر کیا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہے۔

اور جب رعایا کا حال معلوم ہو جاتا تھا تو پھر کیا ہوتا تھا؟

آپ ایک رات گشت کر رہے تھے کہ مدینہ سے تین میل باہر، ایک خیمہ میں بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے بھوکے ہیں اور سامان خوراک ختم ہو چکا ہے۔ آپ اسی وقت مدینہ واپس آئے۔ بیت المال سے آٹا، گوشت، کھجوریں وغیرہ لیں اور اپنے خادم سے کہا کہ اس سامان کو میری پیٹھ پر لاد دو۔ خادم نے کہا کہ میں اٹھا کر لئے چلتا ہوں۔ فرمایا کہ ان بچوں کے لئے بروقت سامان خوراک نہ پہنچانے کا جرم عمر کا ہے۔ جب تم اس جرم کے بار کو قیامت کے دن نہیں اٹھاؤ گے بلکہ اسے عمر کو خود اٹھانا پڑیگا تو اب تم اس بوجھ کو کیوں اٹھاؤ۔ عمر خود کیوں نہ اٹھائے؟ چنانچہ سامان اٹھا کر خیمہ میں آئے۔ خود چولہا جھونکا۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے کھایا پیا اور اچھلنے کودنے لگے۔ بچوں کی والدہ نے کہا کہ:

امیر المومنین بننے کے قابل تم ہو، نہ کہ عمرؓ!

امیر المومنین عمرؓ جب اس واقعہ کو یاد کیا کرتے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ان بچوں کو اتنا وقت کیوں بھوکا رہنا پڑا تو کیا جواب دوں گا!

''حکومت'' کا تاج ہر بوالہوس کے سر پر راست آ سکتا ہے لیکن ''خلافۃ علی منہاج نبوۃ'' کا بوجھ ہر کندھا نہیں اٹھا سکتا۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے　　لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام میں "فکر" کی گنجائش

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پولیٹیکل سائنس کی دعوت پر، پرویز صاحب نے 25 نومبر 1967ء کی صبح، نیو کیمپس میں، اس شعبہ کے ایم۔اے (فائنل) کے طلباء وطالبات سے، مندرجہ بالا موضوع پر خطاب فرمایا تھا۔ خطاب برجستہ تھا جسے، بعد میں "نوٹس" سے قلمبند کرلیا گیا تھا جو کہ نذرِ قارئین ہے۔ (طلوعِ اسلام)

محترم پروفیسر صاحب۔ عزیز طلبائے علم وطالبات۔ سلام ورحمت!

میں بالعموم تقاریر وتقاریب کے سلسلہ میں کہیں جایا نہیں کرتا۔ اس کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہوتا لیکن جب آپ کے نمائندگان نے موجودہ اجتماع کے سلسلہ میں مجھ سے خطاب کے لئے کہا تو میں نے بلاتوقف اظہارِ رضامندی کردیا۔ یہ اس لئے کہ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ اور احساس ہے کہ قوموں کی تشکیل وتعمیر میں نوجوانوں اور طالب علموں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوموں کا مستقبل ہوتا ہی ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس قسم کے آج کے نوجوان طالب علم، اسی قسم کی کل کی قوم۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے پیغام کا اوّلین مخاطب اسی طبقہ کو قرار دیا ہے اور علامہ اقبالؒ کی ہمنوائی میں، میری بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کردے

عزیزانِ من! اس خطاب کے دعوت نامہ میں تجویز یہ کیا گیا تھا کہ متقدمین میں سے کسی مسلم مفکر (Muslim Thinker) پر تنقید وتبصرہ کو موضوعِ خطاب رکھا جائے۔ لیکن میں نے اس سے اختلاف کی جرأت کی جس کی وجہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ (نظریاتی مملکت) ہے اور اس کی درس گاہوں میں (بالعموم) مسلم طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بنابریں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مسلم طلباء جو مضمون بھی پڑھیں، انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کا اس مضمون سے کیا تعلق ہے اور اسے اس کے نظریاتی نقشہ میں کیا مقام حاصل ہے۔ آپ نے کسی "مسلم مفکر" پر محاکمہ کو موضوع خطاب تجویز کیا۔ لیکن میرے نزدیک، سب سے پہلے دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام

میں ''فکر'' (Reason یا Thought) کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ ''مذہب'' کی بنیاد ایمانیات پر ہوتی ہے۔ اور ایمان (Faith) اور فکر (Reason) دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان، کسی بات کو بلا سوچے سمجھے مان لینے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر بات فی الواقعہ یہی ہے، تو پھر ''مسلم مفکر'' کی تو اصطلاح ہی جمع بین النقیضین ہے۔ یہ دو الفاظ (Self - Contradictory) ہیں۔ اگر وہ مسلم ہے تو مفکر نہیں ہوسکتا اور اگر وہ مفکر ہے تو مسلم نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر یہ نظریہ صحیح نہیں، یعنی اسلام اور فکر باہمد گر متضاد حقیقتیں نہیں، تو پھر اگلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ کیا اسلام میں فکر کا میدان لامحدود ہے یا اس کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ اگر اس کی جولانگاہ لامحدود ہے، تو پھر ایک (Secular Thinker) اور (Muslim Thinker) میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہیں تو وہ کیا ہیں اور انہیں کس نے متعین کیا ہے؟

یہ ہیں، عزیزانِ من! وہ وجوہات جن کی بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اس موضوع کو لیا جائے کہ اسلام میں فکر کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس حد تک۔ مجھے اُمید ہے کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ بنیادی موضوع زیادہ موزوں ہے۔ اس تمہید کے بعد آپ اصل موضوع کی طرف آیئے۔

''مذہب'' کے متعلق یہ سمجھنا بالکل صحیح ہے کہ اس میں چند عقائد کو بلا سوچے سمجھے، آنکھیں بند کر کے مان لینا ہوتا ہے۔ اس میں عقل وفکر، غور وتدبر، دلیل وبرہان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں مستقل نزاع، اور (Faith) اور (Reason) میں مسلسل جنگ چلی آرہی ہے۔ لیکن اسلام، میرے عزیزو! مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ دین ہے۔ دین، قانون (Law) کو کہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون کی بنیاد ہی علم وبصیرت اور دلیل وبرہان پر ہوتی ہے۔ سنیے، کہ اس باب میں قرآنِ کریم کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ (17:36)۔ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ علم کہتے کسے ہیں؟ قرآن، اس سوال کا جواب ہماری قیاس آرائیوں پر نہیں چھوڑتا۔ خود ہی جواب بھی دیتا ہے کہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36) تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی؟)

یہ آیت، علم کی دنیا میں ایک عظیم حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسانی حواس (Senses) باہر کی دنیا کے متعلق، کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ اسے (Sense - Data) یا مدرکات (Perceptual - Knowledge) کہتے ہیں۔ یہ اطلاعات، انسانی قلب (Mind) کے سامنے جاتی ہیں تو وہ اس سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اس قسم کے نتائج سے تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ اسے (Conceptual Knowledge) کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے اس ایک مختصر سی آیت میں علم کی اہمیت اور اس کی تعریف (Definition) اور تشریح نہایت جامع انداز میں بیان کر دی۔ اور لوگوں

سے کہا کہ جس بات کا تمہیں اس طرح علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ دوسرے مقام پر وہ اسی کی وضاحت میں کہتا ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنے حواس اور علم وبصیرت سے کام نہیں لیتے، وہ جہنمی ہیں۔ آیت یہ ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ (7:179)

مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، سینے میں دل بھی رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے، یہ اہلِ جہنم ہیں۔ ان کی محض شکل وصورت انسانوں جیسی ہے۔ ورنہ وہ انسان نہیں، حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

آپ نے غور کیا کہ سماعت وبصارت اور قلبِ سلیم سے کام نہ لینے والوں کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ اس آیت میں اس نے اُنہیں حیوان کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ (8:22) خدا کے نزدیک، ساری مخلوق میں سے بدترین وہ لوگ ہیں جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ جب اہلِ جہنم، جہنم میں پہنچیں گے، تو وہاں کے محافظ ان سے پوچھیں گے کہ تم نے بالآخر وہ کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم یہاں آ گئے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب ان کا جواب سنیے:

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۰﴾ (67:10)

وہ کہیں گے، جو کچھ ہم سے کہا جاتا تھا، اگر ہم اسے غور سے سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار کبھی اہلِ جہنم میں نہ ہوتا۔

''ہمارا جُرم یہی ہے کہ ہم نے غور وتدبر اور عقل وفکر سے کام نہ لیا۔'' اسی قسم کے لوگوں کے متعلق، (نبی اکرم ﷺ) سے کہا گیا کہ — اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ (10:42)۔ کیا تو ایسے بہروں کو سنا سکے گا، جو عقل سے کام نہیں لیتے؟ — اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ (10:43)۔ کیا تو ایسے اندھوں کو راستہ دکھا سکے گا جو آنکھیں کھول کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے؟

یہ اس لئے کہ حضور ﷺ کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت تھی اور جو دعوت عقل وبصیرت پر مبنی ہو اس سے استفادہ وہی کر سکتا ہے جو عقل وبصیرت سے کام لے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ — هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ یہ ہے میرا راستہ — اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ؕ (12:108) میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو یہ دعوت علم وبصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی طریق ہے، اور جو لوگ میرا اتباع کریں گے ان کا طریق بھی یہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے، ان سے کہا جاتا تھا کہ میں تم سے کوئی بات دھاندلی سے نہیں منوانا چاہتا، دلیل وبرہان کی رُو سے منوانا چاہتا ہوں۔ تم اگر اسے صحیح نہیں سمجھتے تو هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111)۔ تم بھی اس کے مقابل میں دلیل وبرہان لاؤ۔ کذب وصداقت (جھوٹ اور سچ) کا فیصلہ دلیل وبرہان

سے ہوتا ہے۔ یہ نہ اندھی عقیدت سے ہوتا ہے نہ دھاندلی سے۔

عزیزانِ من! جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلام کے ہر دعویٰ کی بنیاد عقل وفکر پر ہے۔ قلتِ وقت مانع ہے ورنہ میں قرآنِ کریم سے اسی نہج کی اور متعدد آیات پیش کرتا۔ لیکن آخر میں صرف ایک آیت پر اکتفا کروں گا اور آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت ایسی قولِ فیصل اور (یوں سمجھئے کہ) حرفِ آخر ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

حضور ﷺ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں ایک عمر گذار دی۔ اسلامی نظامِ زندگی کی تفصیلات بڑی شرح وبسط سے بیان فرمائیں۔ ایک ایک گوشے کی جزئیات تک کو سامنے لائے۔ لیکن آخر میں آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ دیکھو بھئی! اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ (34:46)۔

میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بات، آپ سوچئے عزیزم! کہ وہ بات کس قدر جامع، بنیادی اور اہم ہوگی جس میں حضور ﷺ کا سارا پیغام سمٹ کر سامنے آجاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ: اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى (34:46) ___ وہ بات بڑی توجہ سے سننے کی ہے۔ اس کے لئے تم (سب کے سب نہیں تو کم از کم) ایک ایک، دو دو، کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور اس کے بعد حضور ﷺ نے وہ ایک بات کہی۔ وہ بات صرف ایک لفظ میں کہہ دی گئی آپ ﷺ نے فرمایا: ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ (34:46) تم سوچا کرو۔ غور وفکر کیا کرو!۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں، مجھے بھی کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں!

یہ ہے عزیزانِ من! اسلام میں فکر کا مقام!

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فکر کا میدان غیر محدود ہے یا کسی خاص حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی فکر کی گنجائش ہے؟ تفصیل اس جواب کی طول طویل ہے لیکن میں مختصر الفاظ میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے ویسے ہی کچھ حدود مقرر ہیں جیسے ایک سائنسدان کے لئے فکری حدود متعین ہوتی ہیں۔ ایک سائنٹسٹ کے سامنے، فطرت کے قوانین ہوتے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ وہ ان قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔ اگر وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے فکر سے کام نہیں لیتا تو اسے بھی سائنٹسٹ نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر وہ ان قوانین سے اعراض برتتا ہے یا تجاوز کرتا ہے، تو وہ بھی سائنٹسٹ نہیں کہلا سکتا۔ فطرت کے یہ قوانین خارجی دنیا سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں، انہیں کلمات اللہ یا مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ قوانینِ فطرت کی طرح یہ قوانین بھی غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی اسی مقام پر سمجھ لیجئے کہ فطرت کے قوانین سائنسدان (یا کسی اور انسان

کے) بنائے ہوئے نہیں ہوتے، وہ خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو وضع نہیں کرتا، بلکہ صرف (Discover) کرتا ہے۔ وہ کتابِ فطرت کو لکھتا نہیں، اسے پڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی انسانوں کی وضع کردہ نہیں ہوتیں۔ خدا کی متعین کردہ ہوتی ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو اپنے تجربات (Trial and Error) کے ذریعے دریافت کرتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی سے متعلق مستقل اقدار، کا علم وحی کی رُو سے دیا جاتا ہے۔ (وحی کا موضوع الگ ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت آپ کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہوگا کہ قوانینِ فطرت کی طرح مستقل اقدار بھی خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔ یہ اقدار، اپنی مکمل شکل میں، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115)

تیرے رب کے یہ قوانین جو صدق وعدل پر مبنی ہیں، ہر اعتبار سے مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی ردو بدل نہیں ہوسکتا۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان (مستقل اقدار) کو کس طرح مانا جائے گا؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح، جیسے قوانینِ فطرت کو مانا جاتا ہے۔ انہیں علم وبصیرت، غور وفکر اور دلائل وبرہان کی رُو سے مانا جائے گا۔ اور جب ان پر عمل کیا جائے گا تو ان کے نتائج، ان کی صداقت کی شہادت بنتے جائیں گے اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ پھر ''ایمان'' کا مقام کونسا ہے؟ اس سلسلہ میں میری مشکل پھر وہی ہے کہ یہ موضوعات بڑے تفصیل طلب ہیں اور آپ نے اس خطاب کے لئے وقت بہت کم رکھا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ''ایمان'' کا ترجمہ (Faith) نہیں (Conviction) ہے۔ ہماری سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ اسلام (جو ایک دین ہے) کی اصطلاحات کا ترجمہ ''مذہب'' کے الفاظ میں کر دیا گیا ہے یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا صحیح تصور ہمارے سامنے آنے ہی نہیں پاتا اور ہمارا ذہن طرح طرح کے شکوک وشبہات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ ایمان (Conviction) کا دوسرا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ (Conviction) پیدا ہی پورے پورے غور وفکر سے ہوتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ ذہن اور قلب کا کامل اطمینان ہوتا ہے۔ جسے اس طرح پورے غور وخوض کے بعد، علم وبصیرت کی بنا پر اس حقیقت پر یقین آجاتا ہے، اسے مومن کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴿۷۳﴾ (25:73)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو یہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔

ان پر آنکھیں کھول کر ایمان لاتے ہیں۔

ان تصریحات سے عزیزانِ من! یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ''مسلم مفکر'' اسے کہیں گے جو ان مستقل اقدار

کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مسائل حیات پر غور وفکر کرے۔ یہی ہمارے لئے اس بات کے پرکھنے کا معیار ہوگا کہ فلاں مفکر کی فکر کس حد تک اسلامی ہے۔ یہ حدود ہمیشہ غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کے دائرے کے اندر کی گئی فکر، قابلِ تغیر وتبدل ہوگی۔ ثبات وتغیر کے اسی امتزاج کا نام اسلامی فکر ہے علامہ اقبالؒ نے اس عظیم حقیقت کو اپنے خطبات میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی وابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر وتنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لیے مستقل، اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس، ہر آن بدلنے والی، دنیا میں ابدی اصول ہی وہ ٹھوس بنیاد ہیں جس پر ہم اپنے پاؤں ٹکا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔۔۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ سیاسی اور معاشرتی دنیا میں یورپ کی ناکامی، اوّل الذکر اصول کی صداقت کی شہادت ہے اور اسلام جس طرح گذشتہ پانچ صدیوں میں منجمد بن کر رہ گیا ہے، ثانی الذکر اصول کی شہادت۔''

یہی وہ حقیقت ہے جسے انہوں نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بری جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری!

ثبات نہ ہو تو قوموں کی حرکت، سفر نہیں، آوارگی بن کر رہ جاتی ہے اور اگر تغیر نہ ہو تو انسان، ممی شدہ لاش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تعینِ منزل کے بعد حرکت ہی ہے جس سے قوموں کی تقدیریں صبح وشام بدلتی رہتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں جلوہ بار فرمایا ہے کہ:

مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاہُ فَھُوَ مَغْبُوْنٌ۔

جس کے دو دن ایک جیسے گذر گئے (یعنی آج جس کا قدم گزشتہ کل کے مقابلہ میں آگے نہ بڑھا) وہ سخت نقصان میں رہا۔ عزیزانِ من! اللہ تمہیں اس کی توفیق عطا کرے کہ تم قوم کا امروز (آج) دوش (گذشتہ کل) سے روشن تر کر دو کہ تم میں سے:

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

(والسلام)

عنایت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

طلوع اسلام کی جنوری 1968ء کی اشاعت کے لمعات میں لکھا گیا تھا کہ ایک مولانا صاحب کا عقیدہ یہ ہے کہ ''عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔'' اور اس کے ثبوت میں انہوں نے لکھا تھا کہ ''جنگ کی ضروریات کے لئے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوجائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔'' اس پر طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ:

> ایک سچا مسلمان سپاہی جب دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے گا تو خواہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کردیئے جائیں وہ نہ اپنی فوج کا پتہ بتائے گا نہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچائے گا۔

محترم عنایت اللہ صاحب یوں تو بزمِ طلوع اسلام میں بھی نو وارد نہ تھے، لیکن جن حضرات کی نظروں سے ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' گزرتا رہا وہ جانتے تھے کہ 1965ء کی جنگ کی کوائف نگاری کے لئے انہیں گویا اتھارٹی تسلیم کیا جاتا تھا (غالباً) طلوعِ اسلام کی محولہ بالا بحث سے متاثر ہوکر کسی نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا اُن کے علم میں کوئی ایسے واقعات آئے ہیں کہ 1965ء کی جنگ میں ہمارے گرفتار ہونے والے سپاہیوں نے جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی ہو۔ اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا، اسے انہوں نے طلوعِ اسلام میں اشاعت کے لئے بھیج دیا تھا کہ اس کے اوراق ہی اس سوال اور جواب کے لئے موزوں تھے۔ ہم اُن کے رشحاتِ قلم کو مکرر درج ذیل کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ہماری فوج کے سپاہیوں کا کردار کیا تھا اور مولانا صاحب، جن کی ساری سیاست ''دردغ مصلحت آمیز کے شرعی وجوب'' کی ابلہ فریب داستان ہے، انہیں کیا سبق پڑھانا چاہتے تھے۔ (طلوعِ اسلام)

مجھ سے پاک فوج کے متعلق ایک عجیب سوال پوچھا گیا ہے۔ میں اس پر حیران نہیں کہ یہ سوال کسی عالم فاضل سے پوچھنے کی بجائے مجھ سے پوچھا گیا بلکہ حیرت اس پہ ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بے معنی سوال پیدا کیسے ہوا ہے۔ سوال

یہ پوچھا گیا ہے کہ پاک فوج کے وہ افسر اور سپاہی جو جنگ ستمبر میں بھارت کے جنگی قیدی ہو گئے تھے، کیا انہوں نے پوچھ گچھ کے دوران جھوٹ بولا تھا؟ یعنی اپنی فوج کے متعلق دشمن کو یہ کہہ کر کچھ نہیں بتایا تھا کہ ''ہمیں معلوم نہیں۔'' حالانکہ انہیں معلوم تھا اور انہوں نے جھوٹ بولا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا ہے کہ کیا اپنی جان اور ملک کی سلامتی کی خاطر جھوٹ بولنا جائز ہے؟

میں یہ سوال سن کر پریشان سا ہو گیا۔ میں یونہی مزاحاً (یا شاید سنجیدگی سے) ایک مولوی صاحب سے پوچھ بیٹھا کہ مولانا! کیا ان حالات میں جھوٹ بولنا جائز ہے؟___ مولانا کھنکارے،، گلا صاف کیا، مجھے گھورا، ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، عصا کو زمین پر مارا___ اور میں لرزہ براندام کہ دیکھئے اس بحر سے اچھلتا ہے کیا!

مولانا مجھے منطق اور لغت کی اندھیری بھول بھلیوں میں لے گئے۔ بات کو جس قدر الجھا سکتے تھے، الجھایا اور نصف گھنٹہ بعد مجھ پر یہ انکشاف کیا روزمرہ کی زندگی میں کسی بھی موقعہ پر دروغ برائے مصلحت جائز ہے یعنی جہاں آپ اپنے مفاد کو خطرے میں دیکھیں آپ شرعاً جھوٹ بول سکتے ہیں___ مولانا نے مجھے ایک فتویٰ بھی دکھا دیا جس میں صاف لکھا تھا___ ''عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجات ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔''

میں اس جھنجٹ میں پڑنے سے گریز کروں گا کہ شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے یا نہیں، کیونکہ میں نہ تو عالم ہوں، نہ میرے ڈاڑھی ہے۔ میں صرف پاک فوج کے جانبازوں کے کردار کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ جنگی قیدی ہو جانے کی صورت میں جھوٹ بولتے رہے ہیں۔ مندرجہ بالا فتویٰ میں یہ بھی لکھا تھا___ ''اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے، تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔''

غالباً اسی فتویٰ کا فتور تھا کہ مجھ سے پوچھا گیا کہ پاک فوج کے جنگی قیدی جھوٹ بولتے رہے ہیں___؟

جی نہیں!

اگر میرا یہ دو لفظی جواب کافی نہ ہو تو میں وضاحت کئے دیتا ہوں۔ میرے پاس زیادہ تر عملی دلائل ہیں۔ علمی دلیل صرف اتنی سی دوں گا کہ اخلاقیات اور نفسیات کی رُو سے مضبوط کردار کی بنیاد ی مضبوطی حق گوئی اور راست بازی ہوتی ہے۔ اگر بنیاد میں یہ عنصر ناپید ہے تو کردار کھوکھلا ہے۔ علمِ نفسیات کی روشنی میں جھوٹ بولنا ایک نفسیاتی مرض ہے جس کے ''جراثیم'' صرف کھوکھلے کردار میں پنپ سکتے ہیں۔ جھوٹ کی صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے اور اس کا نام جھوٹ ہے۔ ''دروغ برائے مصلحت'' کسی دوسری قسم کا نام نہیں۔ جھوٹ ہمیشہ برائے مصلحت یعنی اپنے مفاد کی خاطر ہی بولا جاتا ہے خواہ اس کا بولنے والا ''صالحین'' میں سے ہو اور خواہ ''فاسقین'' میں سے اور یہ وہی جھوٹ ہے جس کی سخت مذمت قرآن نے کی ہے۔ مجھے خوب دیا ہے، کہ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ میں نے ایک روز اپنے ایک استاد (شہید) کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ اُس نے مجھے بے تحاشہ پیٹا، اور اُس روز اُس نے اپنا پیریئڈ (Period) ہمیں

صرف اتنی سی بات ذہن نشین کرانے میں صرف کر دیا تھا کہ جھوٹ سو برائیوں کی جڑ ہوتا ہے اور یہ کہ جو انسان جھوٹ بول سکتا ہے وہ اپنی ماں اور بہن تک کو فریب دینے سے گریز نہیں کرتا۔

ضمناً یہ بھی بتا دوں کہ میرا یہ استاد اگست 1947ء میں امرتسر میں ہندوؤں اور سکھوں کی یلغار کے سامنے بندوق لے کر مورچہ بند ہو گیا تھا۔ اُس نے دشمنوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر کے، کئی گھرانوں کو خیریت سے امرتسر سے نکال دیا تھا اور خود ایمونیشن ختم ہو جانے کے بعد شہید ہو گیا تھا۔ اُس کی شہادت نے کئی مسلمان عورتوں کی عصمت کو محفوظ پاکستان پہنچا دیا تھا۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کے لئے کردار میں ایک خلاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف اُس کردار میں پایا جاتا ہے جس کی کئی کڑیاں ٹوٹی ہوئی ہوں۔ جس کردار کی کڑیاں موجود اور مضبوط ہوں اس میں جھوٹ کے لئے ذرہ بھر خلا نہیں ملتا۔ یہ قانونِ فطرت ہے جس کے لئے کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔

اب پاک فوج کے سپاہی کی طرف آیئے۔ اس مردِ مجاہد کے کردار کی مضبوطی کی میں سینکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن ایک صاحبِ عقل کو مطمئن کرنے کے لئے اتنی سی دلیل کافی ہے کہ پاک فوج کے سپاہی نے ستمبر کی دفاعی جنگ حق کی خاطر لڑی تھی۔ اُس نے صرف دو لاکھ کی نفری سے دشمن کے ساڑھے دس لاکھ کے لشکر کا اچانک اور تاریخ کا شدید ترین حملہ صرف حق گوئی اور بیباکی کے بل بوتے پر جیتا تھا اور جنہیں حق عزیز ہوتا ہے انہیں اپنی جان پیاری نہیں ہوتی۔ انسان کے سامنے سب سے بڑا مفاد اپنی جان کی حفاظت ہوتا ہے اور یہی اس کے کردار کے لئے سب سے کٹھن امتحان ہوتا ہے۔

لیکن پاک فوج کے سپاہی نے سب سے پہلے بطیب خاطر، حق کے لئے، موت کو قبول کیا، اور جب وہ اس کا فیصلہ کر چکا تو پھر وہ اُن مفادات سے آزاد ہو گیا جن کی خاطر جھوٹ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میں نے واہگہ سیکٹر میں لڑنے والے ایک سپاہی سے اُس جذبے کی وضاحت چاہی جس کے تحت وہ لڑا تھا۔ اُس نے سوچ سوچ کر جواب دیا ــــ ''جب دشمن کو دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں شہید ہو گیا ہوں۔ پھر میں بے خوف ہو کر لڑا۔ ایسے معلوم ہوتا رہا جیسے میری روح لڑ رہی ہے لیکن فائر بندی کے بعد پتہ چلا کہ میں زندہ ہوں۔'' اُس کی بات کو دوسرے سپاہی نے اس طرح مکمل کر دیا ــــ ''خوش نصیب تھے وہ جو شہید ہو گئے۔ ہمیں تو یہ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ ہم زندہ ہیں۔''

ایک میجر نے کہا: ''شہید ہونے کے لئے لاشعوری تیاری (Unconscious Preparedness) کی ضرورت ہوتی ہے جو بڑے ہی بلند کردار میں پائی جاتی ہے۔ مجھے دُکھ سا ہوتا ہے جیسے میرے کردار میں یہ خوبی نہیں تھی۔'' وہ اپنے کردار کے متعلق غلط رائے دے رہا تھا۔ وہ لاہور کے انتہائی اگلے مورچے میں مسلسل سترہ دن اور سترہ راتیں لڑتا رہا تھا۔ پہلے روز اُس کے ساتھ تین سو پچیس جوان تھے جو آخری روز کُل پچاس رہ گئے تھے۔ یہ مورچہ بی، آر، بی سے پرے، ڈوگرئی سے بھی دو میل آگے تھا۔ اس میجر نے سترہ دنوں اور راتوں میں دشمن کے اکیس (21) شدید حملے روکے اور اس کے ایک سپاہی کو بھی بی، آر، بی تک نہ پہنچنے دیا۔

میں نے پاسبانِ لاہور، جنرل سرفراز خان سے پوچھا کہ اگر دشمن بی، آر، بی پار کر کے لاہور تک آجاتا تو اس صورتِ حال کے لئے آپ کے پاس کیا انتظامات تھے؟ ___ اس جری جرنیل نے جواب دیا ___ ''میں نے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا تھا کہ ہم دشمن کو نہر پار کرنے دیں گے۔'' ___ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مجھ سے لے کر میرے ادنیٰ سپاہی تک نے تہیہ کرلیا تھا کہ دشمن کو نہر پار نہیں کرنے دیں گے ___ ''ہم نے اپنی جانیں باٹاپور، بھینی، اور برکی کے پُلوں پر رکھ دی تھیں۔ ہمارے سامنے دو ہی صورتیں تھیں ___ دشمن کو نہر سے پرے روکیں گے یا ہم اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔ لہٰذا، ہمارے سامنے یہ سوال ہی نہیں آیا تھا کہ اگر دشمن نے نہر کو پار کرلیا تو ہم کیا کریں گے!''

''سب سے بڑا خطرہ جان کا ہوتا ہے۔'' سیالکوٹ سیکٹر میں لڑنے والے بریگیڈیئر (بعد میں میجر جنرل) امیر عبداللہ خان نیازی نے مجھ سے کہا۔ ''لیکن ہم نے اس خطرہ کو اپنے اعصاب سے جھاڑ کر بارکوں میں پھینک دیا تھا اور خود باہر نکل آئے تھے۔''

جنگوں کی تاریخ میں جنگِ ستمبر پہلا معرکہ ہے جس میں کسی کمانڈر نے اگر فنِ حرب کے تحت برائے مصلحت اپنے سپاہیوں کو ذرا پیچھے ہٹ کر مورچہ بند ہونے کا حکم دیا تو سپاہی اُس کمانڈر کو دشمن اور دشمن کا جاسوس سمجھنے لگے۔

ایئر مارشل نور خان نے غیر ملکی اخباری نمائندوں سے کہا تھا ___ ''میرے لئے مشکل یہ نہیں تھی کہ میں اپنے ہوابازوں کو دشمن کے علاقے میں حملوں کے لئے کس طرح بھیجوں۔ مشکل یہ تھی کہ انہیں حملوں پر جانے سے کس طرح روکوں'' ___ پاک فوج کے کئی افسروں نے مجھے بتایا کہ ان کی سب سے بڑی دشواری یہی تھی کہ ___ سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے کس طرح روکا جائے۔

یہ جذبہ صرف اُس انسان میں ہوتا ہے جو موت کو قبول کر چکا ہو اور جو موت کو قبول کرلیتا ہے وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا۔ یہیں سے یہ سوال اُبھرتا ہے کہ دشمن کی حراست میں ہمارے جنگی قیدیوں کا اُس وقت رویہ کیا تھا جب دشمن اُن سے فوجی راز پوچھتا تھا؟ ___ اُن کا رویہ یہ تھا کہ وہ ہر سوال کے جواب میں کہتے تھے ___ ''نہیں بتائیں گے۔''

فوجیں ابھی سرحدوں پر تھیں۔ میں ہڈیارہ گیا۔ مجھے سترہ پنجاب رجمنٹ کے ایک مجاہد سے ملنا تھا۔ میں نے ستلج رینجرز کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ سترہ پنجاب رجمنٹ کہاں ہے؟ اُس نے نہایت احترام سے جواب دیا ___ ''بھائی صاحب! اگر میں سترہ پنجاب رجمنٹ کا سپاہی ہوتا تو بھی آپ کو نہ بتاتا کہ میری رجمنٹ کہاں ہے'' ___ میں وہاں سے واپس آگیا۔ یہ سپاہی کہہ سکتا تھا کہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اُس نے اتنا بھی جھوٹ نہیں بولا۔

بھارتیوں نے ہمارے جنگی قیدیوں کو انتہا درجہ کی غیر انسانی اذیتیں دی ہیں جو اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ہمارے قیدی افسروں اور جوانوں نے بھارتی افسروں کے ہر سوال کا یہی ایک جواب دیا تھا ___ ''ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا اور کچھ نہیں بتائیں گے۔'' ___ ہم پاکستانی، بھارتیوں کے اس سلوک کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کھیم کرن کے علاقے سے پکڑے ہوئے ہمارے جنگی قیدیوں کے پیٹ

چاک کر دیئے تھے کیونکہ انہوں نے ہر سوال کا یہی ایک جواب دیا تھا ــــ ''ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا اور کچھ نہیں بتائیں گے۔''

ہمارا ہر سپاہی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جس سپاہی نے یہ جواب دیا ہے کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے، لیکن جب اس کی باری آئی تھی تو وہ بھی یہی جواب دیتا تھا۔

ہمارے یہ شہید اور غازی اپنی یونٹ، بریگیڈ اور ڈویژن کے متعلق جھوٹی معلومات دے کر دشمن کی اذیت سے بچ سکتے تھے لیکن انہوں نے قطعاً ایسا نہیں کیا۔

لاہور کے محاذ پر پاک فوج کی انفنٹری کی ایک ایک، دو دو کمپنیاں دشمن کی پلٹنوں کی پلٹنوں پر اور ٹینکوں کا ایک ایک سکواڈرن دشمن کی ٹینک رجمنٹوں پر جوابی حملے کرتا رہا۔ عام فہم زبان میں یوں کہنا چاہئے کہ ہمارے ایک سو سے دو سو تک مجاہد دشمن کے ایک ایک ہزار پر، اور ہمارے آٹھ آٹھ ٹینک دشمن کے پچاس پچاس ٹینکوں پر حملے کرتے رہے۔ یہ جوابی حملے اس قدر تیز اور شدید تھے کہ دشمن ہمیشہ پاک فوج کی ایک سو نفری کی کمپنی کو ایک ہزار نفری کی پلٹن اور دو چار ٹینکوں کو پچیس تیس ٹینکوں کی رجمنٹ سمجھتا رہا۔ بڈیانہ (سیالکوٹ سیکٹر) پر میجر مسعود اختر شہید نے دشمن کے پچاس ساٹھ ٹینکوں پر حملہ کیا تھا اور ذرا سی دیر میں مسعود شہید کے ٹینک تباہ ہوتے ہوتے صرف آٹھ رہ گئے تھے۔ لیکن اُس نے پیش قدمی جاری رکھی اور فنِ حرب کے کمال کے ایسے مظاہرے کئے کہ دشمن کی ایک ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر (کرنل تاراپور) وائرلیس پر اپنے ''پچھلوں'' کو اطلاع دے رہا تھا ــــ ''دشمن (پاکستانی) پوری ٹینک رجمنٹ سے حملہ کر رہے ہیں ایئر فورس بھیجو۔'' ــــ یہ بے تار برقی پیغام ہمارے وائرلیس نیٹوں پر بھی سنا گیا تھا۔

ہمارے دفاعی مورچوں کی نفری بھی انتہائی قلیل تھی۔ بلکہ دفاعی لائن میں جگہ جگہ شگاف تھے جو اگر دشمن کو معلوم ہو جاتے تو وہ اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رات کے وقت دس دس بارہ بارہ جوانوں کی لڑاکا گشتی پارٹیاں آگے جایا کرتی تھیں۔ ایک بار پاک فوج کے دو سپاہی قید ہو گئے کیونکہ وہ دشمن کے مورچوں کے علاقے میں گھس گئے تھے۔ اِدھر اُدھر یہ خطرہ محسوس ہونے لگا کہ وہ دونوں دشمن کو کہیں یہ نہ بتا دیں کہ ہمارے اگلے مورچوں میں جو نفری ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن ان مجاہدوں نے (بعد میں پتہ چلا کہ) غیر انسانی لرزہ انگیز اذیتیں برداشت کیں مگر ایک ہی جواب دیا ــــ ''ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا کچھ نہیں بتائے گے۔''

لاہور سیکٹر میں دشمن پر ایک جوابی حملہ کیا گیا تھا۔ میں اس تاریخی جوابی حملے کی تفصیلات سالنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ'' اپریل 1968ء میں لکھ چکا ہوں۔ خاصی لمبی بات ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ بھارتی کمانڈر آج بھی حیران ہیں کہ پاکستانیوں نے بی، آر، بی کس مقام سے اور کس طرح عبور کر کے یہ حملہ کیا تھا۔ نہر پر کوئی پُل سلامت نہیں تھا۔ اس حملے میں بھی ہمارے چند ایک جوان قید ہو گئے تھے لیکن انہوں نے دشمن کو صرف یہ جواب دیا کہ ہم اپنے نام اور نمبر کے سوا کچھ نہیں بتائیں گے، یہ راز فاش نہیں کیا تھا کہ یہ حملہ کس طرف سے کیا گیا تھا۔

کھیم کرن محور میں ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کے کرنل نذیر اور ان کے متعدد ٹینک سوار دشمن کے گھیرے میں

آ گئے۔ نکلنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ ایمونیشن بھی ختم اور سپلائی کے راستے بھی بند ہو گئے تو کرنل نذیر نے، جوانوں کو بلاوجہ مروا دینے پر قید کو ترجیح دی۔ یہ ایک دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ جب ان سب کو بھارت کے ایک جنگی قیدی کیمپ میں لے جا کر پاک فوج کے متعلق پوچھا جانے لگا تو کرنل سے لے کر سپاہی تک نے ایک ہی جواب دیا___ ''ہم کچھ نہیں بتائیں گے''___ اس سچ کی سزا کرنل نذیر کو بھگتنی پڑی۔ جب وہ جنگی قیدیوں کے تبادلے میں واپس آئے تو ان کی جسمانی اور دماغی حالت دگرگوں تھی کیونکہ انہیں بھوکا بھی رکھا گیا اور طرح طرح کی اذیتیں بھی دی گئیں۔ معلوم ہوا کہ بھارت کے اس قیدی کیمپ میں، پاکستانی قیدیوں نے بھارتی افسروں کو اس قدر پریشان کیا تھا کہ ایک سکھ میجر کہہ اٹھا___ ''تم میدانِ جنگ میں بھی قابو میں نہیں آتے اور قید میں بھی تم قابو میں نہیں آ رہے۔''

یہاں میں ایک اور سپاہی کا واقعہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ بھارتیوں کی قید میں جا کر جہاں پاکستانی مجاہدوں کے لئے موت اور غیر انسانی اذیتوں کا خطرہ یقینی تھا وہاں انہوں نے نہ صرف عقل و ہوش کو ٹھکانے رکھا، بلکہ مزاج کی شگفتگی کو بھی برقرار رکھا۔ جسٹر کے پُل سے آگے ہماری ایک ٹینک رجمنٹ کا ایک ٹینک اُس وقت کھڈ میں پہلو کے بل لڑھک گیا جب ایک خونریز معرکہ اپنی شدت پر تھا۔ اس صورتِ حال میں ٹینک سواروں کو اجازت ہوتی ہے کہ ٹینک کو چھوڑ کر پیچھے آ جائیں۔ لیکن اس ٹینک کے غازی، لڑھکے ہوئے ساکن ٹینک کی توپ سے مسلسل فائر کرتے رہے۔ گرد و غبار اور گولہ باری کے سیاہ دھوئیں میں یہ ٹینک کسی کو نظر نہ آ سکا اور حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ دشمن نے ٹینک کو گھیر کر اسکے سواروں کو پکڑ لیا۔

انہیں پیچھے لے جا کر، ایک ہندو بریگیڈیئر ایک پاکستانی سپاہی سے نہ صرف اُس کی یونٹ کے متعلق پوچھنے لگا بلکہ یہ بھی کہ___ ''اس محاذ پر تمہاری کون کون سی اور کتنی ٹینک اور انفنٹری رجمنٹیں ہیں۔''___ سپاہی نے اپنی یونٹ کا نمبر بتانے سے انکار کر دیا اور دوسری رجمنٹوں کے متعلق کہا کہ ''مجھے معلوم نہیں''___ یہ حقیقت ہے کہ اسے دوسری یونٹوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا کیونکہ وہ اسی روز اس محاذ پر آیا تھا۔ ہندو بریگیڈیئر نے اس سے بار بار پوچھا کہ سیالکوٹ کے سارے محاذ پر پاکستان کا کون کونسا بریگیڈ ہے۔ اس سپاہی نے بریگیڈیئر سے کہا___ ''جناب! میں آپ کے ان سوالوں کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن ایک کام کی بات بتا سکتا ہوں۔''___ بریگیڈیئر نے خوش ہو کر کہا___ ''بولو، بولو، فوراً بتاؤ!''

ہمارے سپاہی نے کہا۔ ''جناب آپ پاک آرمی کا ایک میجر جنرل پکڑ لیں۔ اُسے ان ساری باتوں کا پتہ ہوگا۔''___ اس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ ہندو بریگیڈیئر اس مردِ مجاہد کی حاضر دماغی اور ان حالات میں مزاجی شگفتگی کو برقرار رکھنے پر اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ قہقہے لگانے لگا اور سپاہی سے پوچھ گچھ ختم کر دی۔

پاکستانی اور بھارتی سپاہی میں یہی تو بنیادی فرق ہے کہ پاکستانی سپاہی کا کردار بلند ہے اور بھارتی سپاہی آبرو باختہ ہے۔ اگر ہم اس مفروضے کو تسلیم کر لیں کہ پاکستانی سپاہی نے جہاد کے دوران جھوٹ بولے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ پاکستانی اور بھارتی سپاہی کے کردار میں کوئی فرق نہیں۔ اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ پاکستانی سپاہی بہتر قسم کا لٹھ باز ہے۔

میں جھوٹ کو واجب قرار دینے والے ''علماء'' سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ آپ ''شریعت'' کو اپنے مفاد

کے سانچے میں ڈھالتے چلے جایئے، آپ کو کوئی نہیں پکڑسکتا۔ جہاں ہمارے ہاں ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے وہاں ''شریعت'' کیوں خالص رہے۔لیکن خدارا اپنے دلائل میں پاک فوج کے سپاہی کو استعمال نہ کیجئے۔ایسا کرنے سے آپ اُن شہیدوں کی مقدس روحوں کو بھی اذیت پہنچا رہے ہیں جو اسلام کی خاطر لڑتے لڑتے آپ کی ''شریعت'' کو بھی دشمن سے بچا گئے، ورنہ آج آپ یہ فتویٰ بھی دے چکے ہوتے کہ ہندو مہاراج کو جھک کر سلام کرنا بھی واجب ہے۔

آپ کو اگر اس زمانے میں اتنی سی توفیق نصیب نہیں ہوئی تھی کہ بی، آر، بی سے ورلے کنارے پر کھڑے ہوکر میدان جنگ کو یونہی جھانک ہی آتے، تو اب اپنے دامنِ تقدس کی حفاظت کے لئے، ان شہیدوں اور غازیوں کی پاکبازیوں کو تو داغدار نہ کیجئے۔جھوٹ وہ بولتا ہے جسے اپنے مفاد کی خاطر روباہ بازیوں پر اترنا پڑتا ہے___اور

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

(ماخوذ طلوعِ اسلام، مئی 1968ء)

پرویز صاحب کی آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دہراؤں گا، جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ:

1۔اپنے ذہن میں کسی غیر قُرآنی تصور وخیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

2۔اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قُرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

3۔قُرآنی فکری نشر واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔لیکن جو کچھ کرو خالصۃً بوجہ اللہ کرو۔اس میں کسی ذاتی مفاد یا جذبہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

4۔آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ الجھنے دو۔

5۔اپنے وقت اور توانائی کو، ضدی طبقے کے ساتھ بحث وتمحیص میں ضائع نہ کرو۔قُرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم وبصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

6۔ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے۔

(i) دن بھر میں قُرآنی احکام وتعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔اور

(ii) آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔یاد رکھئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصد زندگی ہے۔

7۔اور آپس میں محبت اور پیار اور مُودّت والفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قُرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللہ آپ کو خوش وخرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔(والسلام!)

پرویزؔ

(''منزل بہ منزل''، صفحہ:181)

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کیسے پڑھی جائے؟

مسئلہء ادائی نماز:

ادارہ طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتاب ''مقامِ حدیث'' میں ہے کہ:۔ ''کہا جاتا ہے کہ اگر احادیث کو نہ مانا جائے تو قرآن کریم کے احکامات پر عمل کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں نماز کا حکم ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔ اس کی کتنی رکعتیں ہوں۔ ہر رکعت میں کیا کیا پڑھا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے خدا کے اس حکم پر عمل کر کے دکھایا اور اسی کے مطابق ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ یہ کہنا کس قدر مبہم ہے کہ ''اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو۔۔۔۔۔'' حدیث کے وجود سے کون انکار کرتا ہے۔ احادیث کے مجموعے ہر جگہ ملتے ہیں۔ کہنا یہ چاہیئے کہ اگر ہم احادیث کو یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کا ریکارڈ تسلیم نہ کریں تو پھر (مثلاً) ہم نماز کس طرح پڑھیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ احادیث کو یقینی ماننے کے بعد بھی نماز کس طریق سے پڑھیں؟۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ شیعہ حضرات کی نماز سنی حضرات سے مختلف ہے۔ اور شیعہ اور سنی دونوں اپنی اپنی نماز کے متعلق دعوے کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے۔ پھر سنی حضرات کی طرف آیئے تو اہل حدیث کی نماز اور حنفیوں کی نماز میں جس قدر فرق ہے، وہ سب کو معلوم ہے۔ اور یہ دونوں فرقے بھی اپنی اپنی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کے عین مطابق قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان نمازوں میں سے کون سی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی نماز تسلیم کیا جائے۔ جبکہ ہر ایک کی نماز اور اس کی جزئیات کی سند میں احادیث موجود ہیں۔ کیا آج کوئی ایسا طریقہ معلوم کیا جاسکتا ہے جس سے یقینی طور پر متحقق ہو سکے کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح نماز ادا فرمائی تھی؟۔'' ذرا آگے چل کر لکھا ہے کہ:

احادیث اور الگ الگ نمازیں:

''کیا احادیث کو یقینی مان لینے کے بعد آپ یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نماز کا فلاں طریقہ ٹھیک رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہے؟۔ ہاں! ہر ایک فرقہ یہ کہہ سکتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا طریقہ عین رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہے۔ لیکن کیا آپ یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا طریقہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہو سکتا ہے؟۔ کیا آپ اسے باور کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کچھ لوگ شیعوں کی سی نماز پڑھتے تھے اور کچھ سنیوں کی سی۔ یا کچھ لوگ اہل حدیث کی سی نماز پڑھتے تھے اور کچھ حنفیوں کی سی۔ یا خود رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ ﷺ

کبھی اُس طریقے سے نماز پڑھتے اور پڑھاتے تھے جس طریق کے مطابق آج شیعہ نماز پڑھتے ہیں اور کبھی اُس طریق کی نماز جیسی نماز آج سنی پڑھتے ہیں۔ اور کبھی اہل حدیث کے طریقہ جیسی نماز اور کبھی حنفیوں کی سی نماز! ظاہر ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ ایک ہی جیسی نماز پڑھتے اور پڑھاتے ہوں گے، اور ساری اُمت ایک جیسی نماز پڑھتی ہوگی۔ دین میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اختلاف کو قرآن کریم اللہ کا عذاب اور فرقہ بندی کو شرک قرار دیتا ہے۔ جب صورت یہ تھی تو پھر سوال یہ ہے کہ کیا اب ایسی صورت کسی طرح بھی پیدا ہوسکتی ہے کہ اُمت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو جائے اور تمام مسلمان ایک جیسی نماز پڑھنے لگ جائیں؟۔ ظاہر ہے کہ جب تک آپ احادیث کو یقینی اقوال و افعالِ رسول اللہ ﷺ تسلیم کرتے رہیں گے، اُس وقت تک اُمت میں وحدت پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کی اپنی اپنی احادیث ہیں اور ہر فرقہ اپنی حدیثوں کو یقینی طور پر اقوال و افعالِ رسول اللہ ﷺ قرار دیتا ہے۔''

فرقہ اور مکتبِ فکر کا فرق:

طلوعِ اسلام مئی و جون: 1982ء، ص: 39، ذرا مکاتبِ فکر اور فرقوں کے فرق پر غور فرمایئے۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے مشہور مفکر (فلاسفر) گزرے ہیں۔ (مثلاً) بوعلی سینا، فارابی، رازی، الکندی وغیرہ۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ''مکتبۂ فکر (School of thought) تھا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بوعلی سینا کے مکتبہء فکر کے پیرو اپنی الگ نماز پڑھتے تھے اور فارابی کا مکتبہء فکر الگ نماز! کیا آج مسلمانوں کے ممالک میں کہیں کوئی گروہ ایسا ہے جو بوعلی سینا کے طریق پر نماز ادا کرتا ہو یا فارابی کے طریق پر!۔۔۔ ان کے برعکس ذرا فرقوں پر نگاہ ڈالئے۔ بخاریؒ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔۔۔ صلوا کما راءیتمونی اصلی (کتاب الاذان)۔۔ ''تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''۔۔ اگر یہ روایت نہ بھی ہوتی تو بھی بات واضح تھی کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ ساری عمر نمازیں ادا فرمائیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ حضور ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا بلکہ خود بھی اسی طرح نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد آج تک نہ تو اُمت میں ذرا سا بھی انقطاع (Gap) واقع ہوا۔ یعنی یہ حادثہ ایک لمحہ کے لئے بھی رونما نہیں ہوا کہ دنیا میں کہیں بھی مسلمان نہ رہے ہوں۔ نہ ہی کبھی نماز کا فریضہ ترک کیا گیا۔ بالفاظِ دیگر، لاکھوں مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ساتھ، حضور ﷺ جیسی نماز ادا کی اور اس کے بعد اس عملِ محسوس کا تسلسل آج تک جاری ہے۔ اس سے عام سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ عملِ محسوس آج بھی بعینہٖ ویسا ہونا چاہیئے جیسا رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا! لیکن امر واقعہ کیا ہے؟۔ یہ کہ مسلمانوں میں متعدد فرقے ہیں اور ہر فرقے کی نماز الگ الگ ہے۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ ہر فرقہ کا دعویٰ ہے کہ جو نماز وہ ادا کرتے ہیں وہ بعینہٖ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ ادا فرماتے تھے! کیا عقلِ سلیم اسے باور کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟۔ یہ فرقے کس طرح ثابت کرتے ہیں کہ ان کی نماز، جزئیات تک، رسول اللہ ﷺ کی نماز کے مطابق ہے؟۔ احادیث کی رو سے۔ فقہ کی رو سے۔ مختلف حدیثیں اور فقہی احکام، ہر فرقہ کی نماز کی تائید میں سند پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان میں بحث اس امر پر چل پڑتی ہے کہ تمہاری حدیث ضعیف ہے اور ہماری صحیح۔'' (یہ بھی پیشِ نظر

رہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی عبادات کے مختلف طریقوں کے ساتھ ساتھ، عبادات کے اوقات بھی مختلف ہیں۔ مؤلف)۔

نمازوں میں اختلاف:۔ اس کے بعد پرویز صاحب موجودہ مختلف فرقوں میں نماز کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں اور اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ''اگر ہم احادیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ نماز کس طرح پڑھی جائے گی؟۔ اس کا اولین جواب تو تصریحاتِ بالا میں موجود ہے کہ احادیث کی رو سے کون سی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز کہا جائے گا؟۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ اور تو اور نماز جیسے بنیادی فریضہ میں بھی اس قدر اختلافات صدیوں سے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کی بنیاد احادیث اور فقہ پر ہے۔ اس کے بعد سوچئے کہ کیا آج کوئی ذریعہ ایسا ہے جس سے حتمی اور یقینی طور پر متعین کیا جا سکے کہ رسول اللہ ﷺ کس طریق کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے؟۔ اسی ایک مثال پر دیگر احکام کو قیاس کر لیجئے!۔ اور پھر آپ خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ ان احکام کی ادائیگی سے کیا یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ہم ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا فریضہ ادا کر رہے ہیں!۔ یہ تمام خلفشار اور انتشار۔ یہ سب اختلاف وافتراق۔ یہ ساری بے یقینی اور نامحکمی۔ یہ سب اس لئے ہے کہ صدرِ اول کے بعد، ملوکیت آ گئی اور ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول'' کا قرآنی مفہوم اُمت کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس کا مفہوم ہم نے اپنے ذہن سے متعین کر لیا۔ اطیعوا اللہ سے متعلق کہہ لیا کہ اس سے مراد کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ اور اطیعوا الرسول کا ذریعہ وہ احادیث جنہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اور ان پر مبنی فقہی احکام۔ جب تک دین کی اس اساس اور بنیاد کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا، اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا، نہ امت میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے، نہ دین کا تمکن اور اسلام کا احیاء ہو سکتا ہے۔''

احادیث اور ادائی نماز:

ظاہر ہے کہ کُتبِ احادیث سے ادائی نماز کے طریقے کا فیصلہ کن جواب نہیں ملتا۔ اگر کتبِ احادیث میں ایک ہی طریقہ درج ہوتا تو پھر تو کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ لیکن کتبِ روایات میں وہ تمام طریقے بطور احادیثِ رسول اللہ ﷺ درج ہیں جو آج مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی ادائیگیٔ نماز میں مستعمل ہیں۔ اور ہر فرقے کی نماز کے جواز کے لئے کئی کئی احادیث موجود ہیں۔ معترضین خود ہی فیصلہ کریں کہ کون سا طریقہ بیان کرنے والی حدیث صحیح اور کون سا طریقہ بتانے والی غلط ہے؟۔ جبکہ احادیث کا لیبل ہر فرقے کا طریقۂ نماز بتانے والی روایت پر چسپاں ہے۔ حضور کریم ﷺ تو ایک ہی طریقے پر نماز ادا کرتے رہے ہوں گے اور ایک دفعہ یا ایک دن نہیں بلکہ دن میں پانچ مرتبہ پورے تیئیس سال تک خفیہ طور پر نہیں بلکہ علی الاعلان لوگوں کے سامنے نماز پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہوں گے۔۔۔ مگر آج یقینی طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ حضور کریم ﷺ نے کس فرقے کے طریقۂ نماز کے مطابق نماز پڑھی اور پڑھائی تھی۔ آج کے موجود تمام فرقوں کے طریقہ ہائے نماز کی اسناد کُتبِ احادیث ہی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ کیا حضور کریم ﷺ نے تمام طریقے استعمال کئے تھے؟۔ قطعاً نہیں۔ پھر تمام فرقوں کی ادائیگیٔ نماز کے طریقوں کے حق میں یہ روایات کہاں سے آ گئیں؟۔ اب بتایئے! کہ کیا احادیث نے مطلوبہ جزئیات کا تعین کر دیا؟۔ کیا حدیث ادائیگیٔ نماز کا مسئلہ حل کرتی ہے؟۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ طریقہ ہائے نماز احادیث سے زیادہ فقہ جات کے اماموں (ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، حنبلؒ، جعفرؒ وغیرہ) سے منسوب ہیں یعنی پوچھا جائے تو لوگ کہتے ہیں کہ میں حنفی، جعفری یا حنبلی

وغیرہ طریق کے مطابق نماز ادا کرتا ہوں اور اسی بناء پر متعدد بار مسلمان ایک دوسرے کو قتل کر چکے ہیں (مئولف)۔

نماز کیسے پڑھی جائے:

مئولف نے 1979ء میں جناب پرویز صاحب کو ایک خط لکھا جس کا جواب انہوں نے براہِ راست دینے کی بجائے مفادِ عامہ کے لئے طلوعِ اسلام اکتوبر 1979ء (ص:9 تا 21) میں شائع کیا۔ اس خط میں دوسرے سوالات کے ساتھ ساتھ مندرجہ ذیل سوالات بھی تھے:

''دین کے اہم ترین رکن ''نماز'' کے بارے میں بھی آپ کو بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے؟۔ آپ کی یقیناً ریسرچ ہوگی کہ حضور پاک ﷺ اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی۔ نماز باجماعت کا حکم بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ لیکن آپ قرآنی کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ درست ہے کہ بہت سے مختلف عقائد کے لوگ جو آپ سے متاثر ہوں گے، ایک دوسرے کے پیچھے قرآنی کنونشن میں بھی نماز پڑھنے سے کتراتے ہوں گے اور آپ کو کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے اپنے طریقوں کے مطابق جا کر نماز ادا کرلیں، لیکن آپ خود بھی تو کسی طریقے پر نماز پڑھتے ہوں گے۔ اور یقیناً (جہاں تک میرا اپنا خیال ہے) وہ طریقہ آپ کی تحقیقات کا نچوڑ ہوگا اور میری نظر میں آپ کی ریسرچ موجودہ دور کے دیگر محققین سے زیادہ صائب ہے۔ کیا آپ صرف ان لوگوں سے علیحدہ نماز پڑھنے کا کہتے ہیں جن کی نماز آپ کی نماز (بلحاظ ادائیگی وغیرہ) سے نہیں ملتی یا تمام لوگوں سے؟''

جواب:

''آپ نے جماعت سازی کے سلسلہ میں نماز کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور یہ بالکل فطری امر تھا۔ اس لئے کہ وہ نماز جو وحدتِ اُمت کا محسوس مظہر تھی، آج اُمت میں تفرقہ کی بین علامت بن گئی ہے۔ دس ہزار مسلمان ایک جلسے میں بیٹھے مقرر کی تقریر سُن رہے ہوں گے اور ان میں باہمی تفرقہ کا شائبہ تک دکھائی نہیں دے گا۔ لیکن جونہی اذان کی آواز کانوں تک پہنچے گی وہ اجتماع مختلف ٹولیوں میں بٹ جائے گا۔ اور اپنے اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھے گا۔ اس قسم کی تشتت خیز نمازوں کا نقشہ آپ متحدہ محاذ (پاکستان کے سابق مصلوب وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف قائم کردہ پی۔ این۔ اے۔ مئولف) میں شامل ان جماعتوں میں دیکھ چکے ہیں، جنہیں مودودی صاحب دین کی تبلیغ کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

جب اجتماعی کوششوں کی صورت میں کسی جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے گا تو دین کے اہم ترین رکن نماز کے بارے میں بھی بتانا ہوگا کہ کس طرح مل کر پڑھی جائے۔ آپ کی یقیناً ریسرچ ہوگی کہ حضور پاک ﷺ اور ان کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی؟۔

ریسرچ:

میرے عزیز! اگر آج کسی طرح بھی حتمی اور یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے کس طرح نماز پڑھی تھی (اور دیگر ارکانِ اسلام ادا فرمائے تھے) تو اُمت کے کس قدر اختلافات مٹ جائیں؟۔ لیکن

مشکل تو یہ ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ سُن کر آپ کو حیرت تو ضرور ہوگی لیکن جب یہ حقیقت ہے تو (بادلِ نخواستہ ہی سہی) مجھے یہ کہنا اور آپ کو سننا پڑے گا۔ آج کوئی ذریعہء تحقیق ایسا نہیں جس سے حتمی طور پر یہ معلوم کیا جا سکے۔ یہ بڑا اہم اور نازک معاملہ ہے۔ اس لئے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنے عرصہء نبوت میں نمازیں پڑھیں اور تنہا اور خلوت میں نہیں پڑھیں، ہزارہا صحابہؓ کی معیت میں پڑھیں۔ یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں تھا جس کے مفہوم کے سمجھنے میں اختلاف ہو جاتا۔ یہ ایک محسوس عمل تھا جسے صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کو کرتے دیکھا اور خود بھی حضور ﷺ کی اقتداء میں ویسے ہی کیا۔ پھر حضور ﷺ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے بھی اس عمل کو جاری رکھا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام دوران میں نماز کی ایک ہی شکل ہوگی۔

تواترِ محسوس:

عملِ محسوس کی صورت یہ ہے کہ وہ ایک نسل سے دوسری نسل تک اُسی شکل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور ہوتا رہتا ہے۔ صحابہؓ کے زمانے سے آج تک اُمت کا سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہوا کہ کسی زمانے میں سابقہ اُمت پوری کی پوری ختم ہوگئی ہو۔ اور پھر کچھ عرصہ کے خلاء کے بعد ایک نئی اُمت وجود میں آئی ہو۔ ایسا نہیں ہوا۔ اُمت کا تواتر اور تسلسل برابر قائم رہا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر نماز کی وہ شکل جو عہدِ رسالت مآب ﷺ میں قائم ہوئی تھی اسے اسی شکل میں آج تک قائم رہنا چاہیئے تھا۔ لیکن آج ہی نہیں، ہمارے ہاں صدیوں سے یہ حالت ہے کہ مختلف فرقوں کی نمازیں مختلف ہیں اور ان اختلافات کی شدّت کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقے کا پیرو دوسرے فرقے والوں کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھ سکتا۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اس نماز کا کیا ہوا جو صدرِ اوّل میں قائم ہوئی تھی اور اس کی جگہ یہ مختلف نمازیں کہاں سے آ گئیں؟۔ ہمارے ہاں کے لٹریچر میں اس کے متعلق کچھ نہیں ملتا۔ آپ فرمائیے کہ ہمارے پاس وہ کون سا ذریعہ ہے جس سے یقینی طور پر کہا جا سکے کہ اُس نماز کی یہ شکل تھی؟

احادیث:

اب آگے بڑھئے!۔ ہر فرقہ اپنی نماز کی تائید میں احادیث پیش کرتا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے ہاں احادیث کے ان مجموعوں میں بھی، جنہیں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے، نماز کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ اور ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے اپنی نماز کی شکل صحیح حدیثوں پر قائم کر رکھی ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہے جس سے حتمی طور پر یہ کہا جا سکے کہ ان میں سے فلاں احادیث کی رو سے نماز کی جو شکل قائم ہوتی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کی نماز تھی۔ ایسا کوئی ذریعہ نہیں۔

تاریخ:

احادیث سے آگے بڑھ کر تاریخ کی طرف آیئے!۔ اسے بھی ہم دنیا کے سامنے بڑے فخر سے پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن ذرا حقائق کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی پوزیشن کیا ہے۔ مدینہ منوّرہ عہدِ رسالت مآب ﷺ اور اوّلین تین خلفائے راشدینؓ کے زمانے تک اس مملکت کا دارالخلافہ رہا جس کی حدود مختلف برِاعظموں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی وسیع و عریض

مملکت کے نظم ونسق کے لئے کوئی سیکرٹریٹ ہوگا۔تحریری احکام جاری ہوتے ہوں گے۔دستاویزات ضبطِ تحریر میں لائی جاتی ہوں گی۔مختلف ولایات کے گورنروں کے ساتھ خط وکتابت ہوتی ہوگی۔دوسری سلطنتوں کے ساتھ معاہدات ہوتے ہوں گے۔حکومت کی آمدنی اور خرچ کے حسابات رکھے جاتے ہوں گے، اس سیکرٹریٹ میں ان سب کا ریکارڈ ہوگا۔لیکن کیا یہ حقیقت موجبِ صد حیرت نہیں کہ ان میں سے کاغذ کی ایک چٹ تک بھی ہمارے ہاں موجود نہیں۔مدینہ منورہ اُس زمانے سے آج تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور آباد اور شاداب رہا۔اس پر باہر سے نہ کوئی حملہ ہوا جس کی بدولت وہ ریکارڈ ضائع ہوگیا ہو۔نہ کوئی زلزلہ آیا کہ وہ عمارات زمین میں دھنس گئی ہوں۔نہ کوئی ایسی آگ لگی۔نہ کوئی سیلاب آیا۔اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ اتنا ذخیرہ بالآخر گیا کہاں؟۔اس کے متعلق نہ کسی نے کوئی تحقیق کی۔نہ اس سوال کا کوئی جواب دیا۔اُس دور کی پہلی مفصّل تاریخ تیسری صدی میں جا کر مرتب ہوئی اور وہ بھی احادیث کی طرح زبانی روایت کی بناء پر۔کسی مؤرخ نے یہ نہیں لکھا کہ میں نے اپنی تاریخ کو اُس دور کی اصل (original) دستاویزات سے مرتب کیا ہے۔یہ جو حضور اکرم ﷺ کے دو چار نامہء مبارک (خطوط) شائع ہوئے ہیں وہ باہر کے علاقوں کے غیر مسلموں کے ہاں سے دستیاب ہوئے ہیں۔یہ ہے ہمارے اُس دور کی تاریخ کی حالت!۔آپ فرمایئے کہ کیا اس کی رو سے اُس دور سے متعلق حتم ویقین کے ساتھ کچھ بھی کہا جا سکتا ہے؟۔اس پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ اُس دور کے احوال وکوائف کے متعلق یقینی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا!۔اس اعتراض کا جواب میرے ذمّے نہیں۔میرے متعلق تو آپ صرف یہ دیکھیئے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت ہے یا نہیں۔۔۔ان تصریحات کی روشنی میں آپ فرمایئے کہ ہمارے ہاں ریسرچ کے وہ کون سے ذرائع ہیں جن کی بناء پر کوئی حتم ویقین کے ساتھ یہ کہہ سکے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے جو نماز ادا فرمائی تھی اس کی ہیئت اور تفصیلات یہ تھیں۔''حتم ویقین'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کے خلاف کچھ ثابت نہ کیا جا سکے۔نماز کی دیگر تفاصیل کو تو چھوڑیئے۔ہمارے ہاں اس ہزار سال میں یہ بھی طے نہیں پا سکا کہ حضور ﷺ نے تراویح کی آٹھ رکعت ادا فرمائی تھیں یا بیس رکعت۔حالانکہ اس کا تعلق محسوس گنتی سے ہے۔

کیا کیا جائے؟:

ان حالات کے پیشِ نظر میں یہ کہتا چلا آ رہا ہوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقے ارکانِ اسلام کو جس جس طریق سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں ادا کرتے رہیں لیکن ایک دوسرے سے جھگڑیں نہیں اس لئے کہ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اُس کا طریق سنّتِ نبوی ﷺ کے مطابق ہے، کوئی بھی حتم ویقین کے ساتھ ایسا ثابت نہیں کر سکتا۔اگر ثابت کیا جا سکتا تو یہ اختلافات کیوں پیدا ہوتے۔اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی کہتا ہوں کہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق حاصل نہیں کہ ان طریقوں میں کوئی ردوبدل کر سکے۔یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے کیونکہ ایسا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی اتھارٹی نہیں ہوگی۔اگر کبھی خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے انداز کی قرآنی مملکت قائم ہوگئی تو اُسے یہ اتھارٹی حاصل ہوگی کہ وہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے کوئی متفقہ طریق متعین کرے۔

فرقہ اہلِ قرآن:

اتھارٹی کے بغیر فرقہ ''اہلِ قرآن'' نے ایک نئی وضع کی نماز ایجاد کی تھی۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوا کہ ''کُل حزب بما لدیھم فرحون'' کی صف میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔

میں نے اپنے جس مسلک کا اوپر ذکر کیا ہے، میں خود بھی اس پر کاربند ہوں۔ میں حنفی گھرانے میں پیدا ہوا اور اس لئے اسی مسلک کے مطابق نماز پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ اگرچہ میں کسی دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے ساتھ نماز پڑھنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا۔

کنونشن میں نماز:

آپ پوچھتے ہیں کہ میں طلوع اسلام، کنونشن کے موقع پر نماز باجماعت کا اہتمام کیوں نہیں کرتا؟۔ طلوعِ اسلام کنونشن میں مختلف مسالک کے پیروکار جمع ہوتے ہیں۔ آپ فرمائیے کہ اس میں کس مسلک کے مطابق نماز باجماعت کا اہتمام کیا جائے؟۔ انہیں کسی ایک مسلک کے مطابق نماز پڑھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور اگر ہر مسلک کے متبعین کو اجازت دی جائے کہ وہ پنڈال میں اپنی اپنی الگ جماعت کھڑی کر لیں تو اس سے تشتت اور انتشار کا جو عبرت ناک منظر سامنے آئے گا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان حالات کے تابع مناسب یہی ہے کہ مختلف مسالک کے لوگ مختلف مساجد میں جا کر اپنے اپنے طریق کے مطابق نماز ادا کر لیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہماری کنونشنوں میں آج تک کسی قسم کا کوئی اختلاف رونما نہیں ہوا۔ وہ وحدتِ فکر و نظر کی بناء پر باہمی اخوت اور مساوات کے مثالی اجتماعات ہوتے ہیں۔ مقصد ان سب کے سامنے ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اُمت میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ (قرآنی مملکت) کا قیام کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے۔''

اردو زبان میں نماز:

1957ء میں لاہور میں یہ تحریک اٹھی کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جایا کرے۔ پھر 1970ء میں بھی اس تحریک کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ کچھ لوگ آج کل بھی دبے لفظوں میں اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ تحریک، قرآن کے خلاف اور بڑے خطرناک، دوررس نتائج کی حامل تھی۔ اس لئے طلوعِ اسلام نے اس کی سخت مخالفت کی اور ملک بھر میں اس کے خلاف جدوجہد کی جس سے یہ فتنہ فرو ہو گیا۔ محترم پرویز صاحب نے اس سلسلہ میں ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جون 1957ء اور پھر مارچ 1970ء میں شائع ہوا۔ اور ان کے مجموعہء مضامین ''سلسبیل'' میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے ''نئی نماز'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ:

نئی نماز:

''اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے اُمت میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہو گا جو ان تمام (مزعومہ) فوائد کو لے ڈوبے گا جس کے پیشِ نظر آپ اس جدت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے! قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ اور شرک جرمِ عظیم۔ ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ

اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے۔ اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے تو خود اس فرقہ کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے وہیں اس سے بچنے کے لئے ''وحدتِ صلواۃ'' کا ذکر کر دیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (32-30:31)۔ ''تم صلواۃ قائم کرو۔ (اور مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ یعنی اُن میں سے جنہوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔''

میرا مسلک:

یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تاکید کرتا چلا آ رہا ہوں کہ اس وقت جس جس طریق سے نماز پڑھی جا رہی ہے اس میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے ردوبدل سے، مختلف فرقوں کی نماز میں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔ (آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس تلقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے)۔ ''وحدتِ صلوٰۃ'' اور وحدتِ اُمت لازم و ملزوم ہیں۔ اور وحدتِ اُمت، صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا، کسی فرد یا گروہ کا، نماز میں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، اُمت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے۔

فرقہ بندی، شرک سے بڑا ظلم:

اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں حضرت ہارون نے کچھ وقت کے لئے بنی اسرائیل کی گئو سالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا (دیکھئے 20:96) لہٰذا، جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نماز اردو یا اردو عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے، الٹا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ امت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں تو اور کیا ہے؟۔ یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا، کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات:۔ ع: کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ۔''

جزئیاتِ نماز:

قرآن کریم میں سوائے چند احکامات کی تفاصیل کے، صرف اصول و اقدار دیئے گئے ہیں جن کی جزئیات ہر زمانے کے

حالات کے پیشِ نظر پوری امت کی باہمی مشاورت سے وضع اور طے کی جاتی رہیں گی۔ نماز کی ادائیگی کے بارے میں بھی سوائے چند باتوں (قیام، رکوع، سجود وغیرہ) کے کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ حالانکہ اس مقصد کی خاطر چند مزید الفاظ کا اضافہ کر دینا خدا کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ نفاذِ ملوکیت سے قبل ہر قسم کے احکامات بشمول ادائیگیٔ نماز مرکزِ خلافت سے جاری ہوتے رہے اور پوری امت ایک جیسی نماز ادا کرتی رہی۔ قیامِ ملوکیت کے بعد دین کی برتری ختم ہوگئی۔ دین مذہب (سیکولرازم) میں تبدیل ہوگیا۔ دین اور دنیا الگ الگ ہوگئے۔ اب مرکزِ حکومت سے پوری زندگی کے جملہ قوانین و احکامات کا سلسلہ بند ہو گیا اور صرف سیاسی (دنیاوی) قوانین و احکامات جاری ہونے لگے۔ فقہاء نے (مجبوراً) انفرادی طور پر قانون سازی اور قرآنی اصول و احکامات کی تفاصیل و جزئیات طے کرنے کا کام شروع کیا تو اپنے اپنے مقلدین کو نماز کی جزئیات اور ادائیگیٔ نماز کے طریقے بھی اپنی اپنی علمی اہلیت، تحقیق اور سوچ کے مطابق الگ الگ بتائے۔ اُس دور میں دیگر اصول و احکاماتِ قرآنی کے ساتھ ساتھ حکمِ نماز کی جزئیات و تفاصیل وضع اور طے کرنے کا کام غلط نہیں تھا مگر یہ کام انفرادی طور پر نہیں بلکہ پوری امت کی مشاورت سے طے پانا چاہیے تھا۔ بدقسمتی سے ادائیگیٔ نماز کا کوئی متفقہ طریقہ سامنے نہ آسکا۔

الگ الگ نمازیں، الگ الگ مساجد:

نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف جزئیات کی بناء پر نمازیں اور مساجد الگ الگ ہوگئیں۔ فرقہ بندی نے جنم لیا اور وحدتِ امت پارہ پارہ ہوگئی۔ چاہیئے یہ تھا کہ پوری امت (پارلیمان کی شکل میں یا جیسے بھی ممکن ہوتا) باہمی مشاورت سے نماز اور ادائیگیٔ نماز کی متفقہ تفاصیل و طریقہ کا فیصلہ کرتی اور پوری امت مل کر اس پر ایک جیسا عمل کرتی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ نہ کسی نے اس اہم مسئلہ پر اس انداز میں سوچا۔ ہر فرقہ نے خود کو صحیح سمجھا اور ایسا ہی سمجھتا چلا گیا۔ اب بھی (اگر ایک اسلامی حکومت قائم ہوجائے، جس کے لئے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرضِ اولیں ہے تو) پوری امت باہمی مشاورت سے نماز کی ادائیگی کے ایک طریقے پر اتفاقِ رائے اور اتفاقِ عمل پیدا کرے گی۔ کیونکہ نماز ہی اتحادِ امت کی اولیں علامت ہے جو کہ آج الگ الگ نمازوں کے باعث اختلافِ امت کی علامت بن چکی ہے۔ البتہ جب تک ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی تب تک، کسی سے تعرض کئے بغیر، جو کوئی جس جس طریق پر نماز ادا کر رہا ہے، ادا کرتا رہے (مؤلف)۔

نماز ادا کرتے رہنا کیوں ضروری ہے:

اس ساری بحث و تمحیص کے بعد اگر کوئی شخص یہ غلط نتیجہ اور تاثر اخذ کرتا ہے (جس کا پروپیگنڈہ پرویز صاحب کے خلاف کیا جاتا ہے) کہ نماز پڑھنے کی کوئی زیادہ ضرورت نہیں ہے تو یہ گمراہی کے علاوہ کچھ نہیں۔ اول تو یہ نتیجہ یا تاثر کسی بھی طرح پیدا نہیں ہوتا کہ نماز پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جب خدا کی طرف سے حکمِ نماز ہے تو اس کا ادا نہ کرنا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟۔ اس کے باوجود کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کی نمازیں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں، اس کے باوجود کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، اس کے باوجود کہ کسی کو صحیح طور پر علم نہیں کہ کون سی نماز حضور کریم ﷺ والی نماز ہے، ہر فرقہ نیک نیتی سے اپنی نماز کو حضور ﷺ والی نماز ہی سمجھتا ہے، اُس وقت تک اپنے اپنے طریق پر نماز پڑھتے

رہنا ضروری ہے جب تک پوری امت کی ایک قرآنی حکومت قائم نہیں ہو جاتی اور وہ واحد طریقِ نماز کا متفقہ فیصلہ نہیں کر دیتی۔ (کسی ایک فرد یا فرقے کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ اپنی نماز دوسروں پر زبردستی تھوپ دے اور انہیں اپنی نماز پڑھنے پر مجبور کر دے، یا کوئی فرد یا فرقہ کوئی نئی نماز ایجاد کر لے)۔ اگر ادائیگی ءنماز (یا دیگر ارکان کی ادائیگی) سے اعراض برتا جائے تو اسلام اور اس کے ارکان خصوصاً نماز کا حشر وہی ہو سکتا ہے جو حشر ہم نے خدا کی طرف سے عطا کردہ (سیاسی) نظامِ خلافت کا کیا ہے۔ 1924ء تک حقیقی اور صحیح طور پر نہ سہی مگر کسی نہ کسی رنگ میں خلافت کا ادارہ موجود رہا۔ کبھی کوئی حقیقی خلیفہ بھی اس عہدہ پر آ سکتا تھا۔ مگر خلافت کا ادارہ ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کے ذہنوں سے ''خلافت'' کا تصور ہی مٹ گیا۔ اور آج ایک سو سال پورے ہونے سے قبل ہی مسلمانوں کی نئی نسل، نظامِ خلافت سے نا آشنا ہو چکی ہے اور اسے ایک سیاسی نظام سمجھنے اور ماننے سے قاصر ہے۔ آج مسلمانوں سمیت، دنیا کے سیاسی نظاموں میں ''نظامِ خلافت'' نظر ہی نہیں آتا۔ آپ شاید ہی کسی کتاب یا میڈیا میں اس نظام کے بارے میں پڑھیں یا سنیں گے۔ اسی طرح اگر خدانخواستہ ادائیگی ءنماز کو بھی غیر ضروری سمجھا گیا تو (نہ صرف نماز بلکہ) پورے اسلام کو نقصان پہنچ سکتا ہے (مؤلف)۔

نماز و روزہ کی اہمیت:

طلوعِ اسلام۔ اگست 2013ء، ص:4: ''میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکینِ بزم کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے، اس کی بناء پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ''طلوعِ اسلام'' نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟۔ آپ نے غیر قرآنی روشِ زندگی کو تو نہ چھوڑا، اور اس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔ طلوعِ اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عائد کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔ آپ قرآنی نظریات کے خلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت، کاروبار، شادی، رشتے ناطے، سب کچھ ہو رہا ہے۔ بینک بیلنس برابر قائم ہیں۔ قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا۔ پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوعِ اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے سلسلہء کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں ہی سے کر سکتے ہیں لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہوگی؟۔ خدارا اپنے قول و عمل کو بصیرت، علم اور خلوص پر مبنی رکھئے۔ ''مقدس بہانے'' تلاش نہ کیجئے بلکہ اعتراف کیجئے اپنی کمزوریوں کا۔ ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔''

(منزل بہ منزل از پرویز، ص:35-36، طلوعِ اسلام، مئی 1959ء، ص:14)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ غیر مسلم جو اچھے کام کرتے ہیں کیا وہ جنت میں جائیں گے؟

ہمارا سارا پریس مذہب زدہ ہے۔ صرف ڈیلی ٹائمز سیکولر اور لبرل حضرات کی آماج گاہ ہے۔ اس اخبار میں زیادہ تر مضامین اُن حضرات کے ہوتے ہیں جو لبرل اور سیکولر نظریات کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب کے مضامین اسی اخبار میں شائع ہوتے ہیں ہمیں ڈاکٹر صاحب موصوف سے کافی عرصہ سے نیاز مندی حاصل ہے۔ ایک مرتبہ وہ ہمارے غربت کدہ پر بھی تشریف لائے تھے۔ جس کے سبب ہماری عزت افزائی ہوئی۔ اگرچہ ان کی والدہ محترمہ لکھنؤ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن خود ڈاکٹر صاحب ضرورت سے زیادہ ہی Punjab Oriented ہیں۔ انہوں نے تقسیم کے فسادات کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ بذات خود مشرقی پنجاب اور پٹیالہ وغیرہ جا کر براہ راست معلومات حاصل کی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''The Idea of Justice'' اٹھارہ فروری کے ڈیلی ٹائمز میں طبع ہوا ہے۔ پہلے ہم اس مضمون کا ملخص جناب کی خدمت عالیٰ میں پیش کرتے ہیں۔ پھر اس مضمون پر اپنا تبصرہ عرض کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے تحریر فرمایا کہ تقسیمِ ہند کے دوران جو فسادات ہوئے، ان کے دوران روپڑ میں بھی بہت کشت وخوں ہوا۔ روپڑ کے فسادات کے دوران ایک 4 سالہ بچی کسی طرح بچ گئی اور اس کو ایک سکھ نے Adopt کر لیا۔ اس سکھ نے اس بچی کی پرورش کی اور اس کا نام نصیب کور رکھ دیا۔ یہ بچی چونکہ سکھ ماحول میں پلی بڑھی۔ اس لئے اس نے سکھ مذہب ہی اختیار کر لیا۔

نصیب کور کا کنبہ اور اس کی والدہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ اس کی والدہ کو نصیب کور کے بچھڑنے کا بہت رنج وغم تھا۔ ہندوستان کے سکھ ہر سال ایک مرتبہ ننکانہ صاحب زیارت کے لئے آتے ہیں۔ نصیب کور کی ماں ہر سال اس موقعہ پر ننکانہ صاحب جاتی تھی اور ہندوستان سے آئے ہوئے سکھوں سے اپنی بیٹی کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ ایک سال اتفاق سے وہ ہی خاتون ننکانہ صاحب آئی جس نے نصیب کور کو پناہ دے کر اس کو سکھ صاحب کے حوالہ کیا جس نے اس کو Adopt کیا اور اس کی پرورش کی۔ اس خاتون کی معرفت نصیب کور کی والدہ کو نصیب کور کے Whereabouts کا علم ہو گیا۔

1991ء میں نصیب کور کی ماں، روپ کور گئیں اور اپنی لختِ جگر بیٹی سے ملیں۔

ہم نے نہایت مختصر الفاظ میں ڈاکٹر صاحب کا تحریر کردہ وہ واقعہ بیان کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ نصیب کور اپنے سکھ مذہب پر مطمئن تھی۔ اسی طرح اس کی ماں ایک پرہیز گار مسلمان عورت تھی اور اپنے مذہب پر مطمئن تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ نصیب کور جنت میں جائے گی یا نہیں ہم ڈاکٹر صاحب کے اپنے الفاظ تحریر کرتے ہیں۔ ''Be Entitled to go to Heaven'' اس سوال کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے سرگنگا رام کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ سرگنگا رام نے انسانیت کی بہت خدمت کی ہے اس لئے انہیں جنت میں جانا چاہئے جبکہ ڈاکٹر صاحب نے چونکہ انسانیت کی کوئی خدمت نہیں کی، وہ جہنم میں جانے کو ترجیح دیں گے۔

سرگنگا رام کے جنت میں جانے، اور خود کے جہنم میں جانے کو ترجیح دینے کی وجہ بھی ڈاکٹر صاحب نے خود ہی تحریر کی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ جنت اور جہنم میں جانے کا واحد معیار Merits ہونے چاہئیں۔ سرگنگا رام نے چونکہ رفاہِ عامہ کے بہت کام کئے ہیں اس لئے وہ جنت میں جانے کے مستحق ہیں جبکہ ڈاکٹر صاحب نے چونکہ رفاہ عامہ کے کام نہیں کئے۔ اس لئے انہیں جہنم میں جانا چاہئے۔

ہم نے نصیب کور کا واقعہ احتیاطاً تحریر کر دیا ہے ورنہ اس واقعہ کو تحریر کئے بغیر بھی اصل سوال سامنے آسکتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ غیر مسلم حضرات جو انسانیت کی فلاح کے لئے کام کرتے ہیں ان کو ان کے کاموں کا بدلہ ملے گا یا نہیں اور وہ جنت میں جائیں گے یا نہیں۔

یہ سوال صرف ڈاکٹر صاحب کا ہی نہیں ہے۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں جنت اور جہنم میں جانے کا تصور قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جنت اور جہنم بڑے بڑے صحرا ہیں یا بڑے بڑے ہال ہیں کہ نیک لوگوں کو جنت میں بھیج دیا جائے گا اور بُرے لوگوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا گویا کہ جنت اور جہنم دو مقامات کے نام ہیں۔ جبکہ قرآنِ کریم کے مطابق ان دونوں چیزوں کا جگہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ نفس انسانی کی کیفیات کی تعبیرات ہیں۔ اس کی تفصیل پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کیا اور اس کائنات میں زندگی بھی پیدا کر دی۔ ابھی انسانی ذہن اس بات سے قاصر ہے کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ یہ زندگی اللہ تعالیٰ نے کس وقت پیدا کی۔ انسان کو اس زندگی کی موجودگی کا اس وقت علم ہوا جب یہ زندگی کسی پیکر میں نمودار ہوئی۔ کس پیکر (اولین جرثومہ) میں نمودار ہونے کے بعد زندگی لاکھوں سال میں طرح طرح اور وضع وضع کی شکلیں تبدیل کر کے، انسانی زندگی کی طرح پر پہنچی۔ اور ہمیں انسانی زندگی کا احساس اس مرحلہ پر جا کر ہوا۔ جب زندگی انسانی حدود میں داخل ہوئی تو قرآن نے اس کو انسانی زندگی کہہ کر پکارا اور اس سے پیشتر کے مراحل کو موت سے تعبیر کیا (2:28) جسم کے خستہ اور بوسیدہ ہو جانے سے جسم ختم ہو جاتا ہے لیکن انسانی زندگی (ذات) باقی رہتی ہے، اور آگے چلتی

جاتی ہے۔ البتہ ہم اپنے موجودہ ذرائع احساس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ یہ نہیں کہ مرنے کے بعد یہ زندگی (ذات) ختم ہوجاتی ہے۔ وہ تو موجود رہتی ہے۔ لیکن ہمارے ذرائع اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ زندگی تو موجود ہے۔ ہم اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ قرآنِ کریم اس کو موت سے تعبیر کرتا ہے۔ زندگی پھر موجود ہوجاتی ہے۔ قرآنِ کریم اس کو حیات آخرت کہتا ہے۔ انسانی زندگی کی ابتداء مٹی سے ہوئی (32:7) لیکن مٹی میں تو زندگی کے آثار نہیں ہوتے زندگی کا سارا دارومدار، اور اس کا انحصار پانی پر ہوتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط (21:30) ہم نے ہر چیز کو پانی سے پیدا کیا، زندگی کی ابتداء طین لازب، پانی کے ساتھ ملی ہوئی چپچپی مٹی سے ہوئی (37:11) یہ وہ مٹی ہے جو تالابوں کے کنارے پر جمی ہوئی ہوتی ہے۔ تالابوں کے کناروں پر جہاں پانی مٹی سے ملتا ہے اور اس پر اوپر سے دھوپ پڑتی ہے تو وہاں زندگی کا اولین جرثومہ Life Cell پیدا ہوا ہے۔ یہاں سے زندگی مختلف مراحل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھی، نئے نئے پیکر بدلتی چلی گئی۔ قرآنِ کریم جب ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (7:189) لہٰذا تو اس سے مراد یہی اولین جرثومہ ہے۔

زندگی (The Life) ہزاروں، لاکھوں سال میں، آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے آگے بڑھی، اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی Energy، عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ توانائی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے پکارتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے پکاری جاتی ہے اور یہی توانائی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں۔ قرآنِ کریم چونکہ روح انسانی کا قائل نہیں ہے اس لئے وہ انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب سمجھتا ہے۔ قرآن کریم چونکہ روحِ انسانی کا قائل نہیں اس لئے قرآن نے روح کی تربیت کے اصول بھی بیان نہیں کئے۔ اس کے برخلاف جہاں تک نفس انسانی کا تعلق ہے قرآن کریم چونکہ اس کو سند کرتا ہے اور اس کی نشوونما کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے اس لئے اس کے Development کے طریقے خود مقرر کرتا ہے ارشادِ عالی ہے: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ط بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ (4:49) ترجمہ: اے رسول کیا تم نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی جو آپ بڑے مقدس بنتے ہیں، خدا جن کو چاہتا ہے مقدس بناتا ہے اور ظلم تو کسی پر بھی تاگے کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ انسانی ذات کی نشوونما قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہوتی ہے (2:286)۔ یہ وہ مقام ہے جہاں وحی الٰہی کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کے علاوہ کسی جگہ بھی نہ تو نفسِ انسانی کا تصور پایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی تربیت کے اصول کسی دوسری جگہ سے مل سکتے ہیں۔ اس وقت اس دنیا میں موجودہ سطح پر انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اس ذات کی اس درجہ نشوونما ہوجائے کہ وہ مرنے کے بعد

اگلی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجائے۔ موت تو اس لئے ہے کہ اس سے اس بات کو Test کیا جاتا ہے کہ انسانی ذات میں کس درجہ استحکام پیدا ہوگیا ہے۔

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط (67:2)

موجودہ انسانی زندگی ایک کارگاہِ عمل ہے۔ جو شخص اس زندگی میں اپنے نفس کو اس درجہ نشوونما دے دے گا کہ وہ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہوجائے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جنت میں داخل ہوگیا جس کو ڈاکٹر صاحب نے ''Be Entitled to go to Heaven'' تحریر کیا ہے۔ اس کے برخلاف جن لوگوں کا اُس دنیا کی زندگی میں شعور تو پیدا ہو چکا ہوگا، لیکن اُنہوں نے اپنی ذات کی نشوونما نہیں کی ہوگی انہیں موت کے بعد کی زندگی میں اس بات کا خوب احساس ہوگا کہ وہ زندگی کے ارتقائی مراحل میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس احساس کی بیداری، لیکن اگلے مرحلہ میں ترقی کرنے سے محرومی، یہ وہ کیفیت ہوگی جس کو قرآنِ کریم نے جہنم میں جانے سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے انسان کی اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ (20:74)

جہنم میں ان لوگوں کو نہ زندگی نصیب ہوگی اور نہ ہی اُنہیں موت آئے گی۔

یہ کیفیت بڑی ہی دردناک ہوگی جس کا نقشہ پھر قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

يَّاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ط (14:17)

اُنہیں چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی۔ لیکن وہ مریں گے نہیں، ڈاکٹر صاحب نے جو To go to Heavan کے متعلق دریافت کیا ہے تو اصولی طور پر تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے اپنی نفس کو اس درجہ مضبوط کرلیا کہ وہ زندگی کے اگلے مراحل طے کرنے کے قابل ہوجائے، تو وہ جنت میں چلا گیا اور جس نے اپنی نفس کی نشوونما نہیں کی، تو وہ زندگی کے اگلے مدارج میں داخل ہونے کے قابل نہیں ہوگا اور اس کی نفس کی کیفیت کی تعبیر کے لئے جہنم کا لفظ استعمال ہوگا جو اس انسانی زندگی میں یقین ہی نہیں کرتا اس کا اس میں کیا حصہ ہوسکتا ہے:

اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (3:77)

ترجمہ: ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ نہ تو آخرت کو مانتے تھے۔ نہ جہنم کو مانتے تھے نہ خدا کو مانتے تھے۔ پھر انہوں نے یہ کام کیوں کئے۔ جب آپ کیوں کا تجزیہ کریں گے تو اُن کا جواب یہی ہوگا کہ مجھے یہ اچھا لگتا تھا۔ مجھے اس سے اطمینان ہوتا تھا۔ معاشرے میں میری عزت میں اضافہ ہوتا تھا۔ تو جس مقصد کے لئے انہوں نے یہ کام کئے تو وہ مقصد تو انہیں اس دنیا میں حاصل ہوگیا۔ وہ صلہ تمہیں دنیا میں مل گیا۔ مرنے کے بعد تم بھی تمہارے عقیدہ کے مطابق ختم ہوگئے، تمہارے وہ اعمال بھی ختم ہوگئے اب ہم سے کیا مانگتے ہو۔

جو لوگ اس دنیا کے طبعی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں لیکن مستقل اقدار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، نہ اُن پر عمل

کرتے ہیں انہیں اس دنیا کا مفاد تو مل جاتا ہے لیکن آخرت کی زندگی میں ان کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن جو لوگ طبعی قوانین اور مستقل اقدار دونوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، اور ان دونوں پر عمل کرتے ہیں۔ اُنہیں دنیا اور آخرت دونوں میں حصہ ملے گا۔ قرآنِ کریم مومنین سے اسی بات کی توقع کرتا ہے۔ اس قسم کے ثواب کو جو دنیا اور آخرت دونوں میں ملتا ہے قرآن اس کو ''الباقیات الصالحات'' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ ثواب اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق کام کرنے کے نتائج ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کا فرمان ہے کہ خدا بہترین ثواب دینے والا، اور بہترین انجام مرتب کرنے والا ہے (18:44) اس قسم کا ثواب ان لوگوں کو ملتا ہے جو ہجرت، جہاد اور اللہ کے دین کو قائم کرنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اقامت دین کے سلسلہ میں اگر جنگ کی نوبت آجائے تو اس کے لئے ثابت قدم رہتے ہیں۔ (3:146)

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں سرگنگارام کا خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ انہوں نے فلاحِ انسانیت کے لئے بہت کام کئے اس لئے وہ جنت میں جانے کے مستحق ہونے چاہئیں۔

سرگنگارام اور اُن جیسے لوگوں کی انسانی خدمات کی حقیقت ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کریں ہمارے ماتحت ایک دیانتدار کلرک کام کرتا ہے اور ہمیں اس سے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ وہ ہماری اور ہمارے ساتھ بد دیانت لوگوں کی نشاندہی نہ کردے۔ اس خطرہ کے پیش نظر ہم اسے کسی طرح ملازمت سے نکلوا دیتے ہیں۔ لیکن اس کلرک کی ملازمت سے برطرفی میں ہم نے جو حصہ لیا۔ اس کا اس کو کوئی علم نہیں ہے۔ ہم اس کلرک سے زبانی ہمدردی کرنے کے علاوہ، گاہے بگاہے اس کی مالی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں آپ غور کریں کہ ہماری معمولی سی مدد کوئی حیثیت یا کوئی نیکی کا پہلو رکھتی ہے۔ یا فرض کریں کہ ہم کسی شخص کو کسی کے ذریعے ٹھوڑا سا زہر دلوا دیتے ہیں، لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ پھر اس کا علاج معالجہ میں اس کی مدد کردیتے ہیں۔ تو کیا یہ علاج کرانا کوئی نیکی ہوگی۔ سرگنگارام اور اس ذہنیت کے لوگ خود ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ان جیسے ایک فیصد لوگ عیش کرتے ہیں اور باقی 99 فیصد لوگ ان کے محتاج رہتے ہیں اور جب ایک انسانیت ساز، نظام قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہی لوگ اس نظام کی اقامت میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ تاکہ باطل نظام کو جاری رہنے دیں لوگ ان کے محتاج رہیں۔ اصل حل یہ ہے کہ نظام ہی ایسا ہونا چاہئے کہ لوگوں کو ان کی مدد کی ضرورت ہی نہ ہو۔

عقل انسانی نے دنیا میں جتنے نظام وضع کئے وہ سرگنگارام جیسے لوگوں کے وضع کردہ ہی ہیں اور یہ نظام ان کو ہی فائدہ دیتے ہیں۔ آج کل جمہوریت کا بہت دور دورہ ہے۔ اس کے عیوب و نقائص ہم نے ایک دوسرے مضمون میں تحریر کئے ہیں۔ اس مضمون میں ایک بات تحریر کرنے سے رہ گئی تھی وہ ہم یہاں تحریر کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30:32) قرآن کریم میں دین و دنیا، مذہب اور سیاست کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ جو چیز مذہب میں حرام ہے وہ سیاست میں حرام ہے اس کا نظام دین و دنیا دونوں کو Cover کرتا ہے۔ جو چیز مذہب میں شرک ہے وہ ہی سیاست میں شرک ہے۔ اس لئے فرقہ بندی اور سیاسی پارٹیاں بنانا، دونوں شرک ہیں۔ جمہوریت کی تو بنیاد ہی شرک پر ہے۔ قرآن کریم

مغربی جمہوریت کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔

اس دنیا میں ہر انسان کا زندگی بسر کرنے کا واحد مقصد نفس انسانی کو اس درجہ نشوونما دینا اور مضبوط کرنا ہے کہ وہ موت کے بعد ارتقاء کی مزید منازل طے کرتی چلی جائے۔ یہی اس کا جنت میں جانا ہے اور نفس انسانی کو یہ نشوونما صرف قرآنی نظام میں حاصل ہوسکتا ہے جس میں مستقل اقدار اور صفات خداوندی پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی غیر اسلامی نظام میں نہ تو مستقل اقدار پر عمل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی صفات خداوندی پر۔ غیر اسلامی نظام میں ہنسی خوشی بسر کرنا ہی جرم ہے (6:123) جو لوگ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97)۔ اس نظام میں اس کے لیڈر عوام کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔ اس نظام کے لیڈروں اور اس کے عوام کے جو جھگڑے ہوں گے وہ قرآن نے بیان کئے ہیں۔ جہنم میں وہ ایک دوسرے کو مطعون کریں گے۔ لیڈر عوام کو جہنم میں جانے کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور عوام لیڈروں کو بُرا کہیں گے۔ کہ وہ ان کی وجہ سے جہنم میں گئے۔ قرآن نے ان کے یہ جھگڑے اور تلخ کلامیاں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ جہنم کے یہ مکالمے ہر جگہ اور ہر مقام پر ایک ہی طرح کے ہوں گے۔ ہم وہ مکالمے درج کرتے ہیں۔ آپ ان کو اپنے دور کے پاکستانی لیڈروں پر منطبق کرتے چلے جایئے۔ ان کے نام آپ خود ان کے احوال سن کے اپنے ذہن میں لاتے رہیئے۔ ہمارے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ان کے نام تحریر کریں۔ یہ جھگڑے بہت عبرت ناک اور بصیرت افروز ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لیڈر کس درجہ مفاد پرست ہوتے ہیں۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ ہمارے ہاں رشوت کا رواج ہے۔ سینٹ کے انتخاب میں کروڑوں روپوں کی رشوت چلی ہے۔ T.V چینلز کے مطابق ایک سو چار (104) سے لیکر ایک سو بیس (120) سینٹرز تک اس میں ملوث ہیں۔ رشوت کا ذکر قرآن میں درج شدہ مکالموں اور تلخ کلامیوں میں نہیں ہے۔ اس کا اضافہ آپ خود کرلیں جہنم میں جب پاکستانی لیڈروں اور عوام کے مکالمے اور تلخ کلامیاں درج ہوں اس میں ایک دھوکہ اور فریب کا ذکر ضرور ہوگا۔ کیونکہ دھوکہ بازی اور لوٹ کھسوٹ میں ہمارے لیڈر دوسرے معاشروں کے لیڈروں سے پیچھے نہیں ہیں بلکہ شاید آگے ہی ہوں گے۔

(1) سورۂ ابراہیم میں ہے کہ عوام اپنے لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم تمہارے پیچھے پیچھے چلا کرتے تھے۔ اب اس عذاب کو ہم سے ہٹاؤ۔ تم تو اپنی قوت اور اقتدار کے بڑے بڑے دعوے کرتے تھے۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہم تو خود عذاب میں مبتلاء ہیں ہم تمہاری کیا مدد کریں۔ اب آہ و پکار کرنا فضول ہے (40:47-48)۔

(2) سورۂ احزاب میں ہے کہ عوام خدا سے کہیں گے ہم اپنے جرائم کے ذمہ دار نہیں ہے ہم ان لیڈروں کی اطاعت کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے۔ اس لئے ان کو دُہرا عذاب دو۔

رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾ (33:68)

ان کا یہ عذر قابل پذیرائی نہیں ہوگا۔ ارشاد ہوگا تم سے کس نے کہا تھا کہ تم عقل سے کام نہ لو۔

(3) سورہ سباء میں ہے کہ جب لیڈر عوام سے کہیں گے کہ تم خود ہی غلط راستہ پر چلنا چاہتے تھے۔ ہمارا تم پر کیا زور تھا جو

ہم تمہیں غلط راستے پر زبردستی چلاتے۔ وہ عوام جواب میں کہیں گے کہ تم دن رات اس طرح کی شاطرانہ چالیں چلتے تھے کہ ہم سادہ لوح لوگ تمہارے دھوکے میں آجاتے تھے یوں تم ہمیں غلط راستہ پر ڈال دیتے تھے (37:32، 34:33)۔

(4) سورۂ مومن میں ہے کہ عوام اور لیڈر اپنے باہمی جھگڑے کے بعد جہنم کے محافظین سے کہیں گے کہ تم ہی کچھ ایسا کرو کہ ہم پر سے یہ عذاب ہلکا ہو جائے۔ لیکن ان محافظین کے پاس اس کا اختیار ہی نہیں ہوگا (40:47)۔

(5) ایک مقام پر ہے کہ عوام کو جہنم کا فیصلہ سنایا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے وہ ہمارے لیڈر اور مذہبی راہنما جنہوں نے ہمیں تباہ کیا۔ اُنہیں ایک مرتبہ ہمیں دکھا دے کہ اُنہیں ہم اپنے پاؤں تلے روند کر دل کا عناد نکال لیں (41:29)۔

(6) سورۂ شعراء میں لیڈروں کو ابلیس اور ان کے پیروؤں کو ابلیس کا لشکر کہہ کر پکارا گیا ہے اور جہنم میں ان کی باہمی گفتگو کو نقل کیا گیا ہے۔

قرآن کریم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اگر کسی انسان تک وحی کی تعلیم نہیں پہنچی اور اس کے پاس اچھے اور بُرے کا معیار ہی نہیں پہنچا تو وہ اتنا ہی کر سکتا ہے کہ جن کاموں کو وہ اپنی دانست میں اچھا سمجھتا ہے ان پر کاربند رہے اور جنہیں اپنی دانست میں بُرا سمجھتا ہے ان سے بچا رہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کے پاس وحی الٰہی تو پہنچ جائے لیکن اس شخص میں سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، مثلاً بچے، پاگل، یا ایسی اقوام و افراد جن کی ذہنی سطح پست ہو وہ بھی مواخذہ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ذمہ داری اس فرد اور اس قوم پر ہوگی جس تک وحی پہنچ چکی ہو۔ اس قوم یا فرد میں سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ جو لوگ یا جو اقوام ان دو چیزوں کے حامل نہیں وہ کسی قطار شمار میں نہیں آتے۔

آپ نے خوب انداہ فرما لیا ہوگا کہ اس دنیا کی سٹیج انسانی زندگی میں کس قدر اہم مقام رکھتی ہے۔ جس نے اُسے ضائع کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے تباہ ہو گیا۔ یہاں کا ایک ایک سانس عمر جاودان سے زیادہ قیمتی ہے اور لیڈروں اور عوام کے مکالمے بھی وہاں سے ہی لئے ہیں۔

ہم نے اس مضمون کے تحریر کرنے میں ''جہانِ فردا'' سے استفادہ کیا ہے۔ جن حضرات کو نفس کی نشوونما کے موضوع سے دلچسپی ہو اُنہیں چاہئے کہ وہ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے طبع شدہ ''جہانِ فردا'' اور ''من و یزداں'' کا مزید مطالعہ کریں اس کے علاوہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب ''تزکیہ نفس'' بھی اس موضوع پر بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ بھی بہت فائدہ مند ہوگا۔ یہ کتابیں میری ویب سائٹ پر موجود ہیں۔

□□□□

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر17)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

شفاعت کے تصور کا تجزیہ:

اِس ضمن میں زیادہ بحث میں اُلجھنے کی بجائے قرآن سے ایک ہی آیت کے حوالہ سے وضاحت کی جاتی ہے کہ:

15۔ قُلۡ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (6:15)

(اے رسول!) کہہ دو: اگر میں بھی اپنے نشو ونما دینے والے کے قوانین کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی (دنیا و آخرت میں) ظہور نتائج کے دن سخت سزا ملے گی (کیونکہ اس کا قانون مکافات کسی کی رعایت نہیں کرتا)۔ رسول بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے نہیں بچ سکتا، تو شفاعت رسول ﷺ کا عقیدہ رکھنے والوں کو سوچنا چاہیے۔

خدا اس آیت کے الفاظ کو اس ذاتِ گرامی ﷺ کی زبان مبارک سے کہلوا رہا ہے، جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اتنی بڑی عظیم الشان ہستی کہہ رہی ہے کہ اگر میں بھی اپنے رب کے قوانین کی خلاف ورزی کروں، تو مجھے بھی (دنیا و آخرت میں) ظہور نتائج کے دن سخت سزا ملے گی۔ عدل تو کہتے ہی اس کو ہیں۔ قانون ہوتا ہی بے لاگ ہے۔ یہ فرد اور فرد میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اگر رعایتیں ملنی شروع ہو جائیں، تو پھر وہ قانون عدل پر نہیں رہتا۔ امت تو ایک طرف رہی، یہ آیت بتا رہی ہے کہ رسول ﷺ خود بھی خدا کے قانون مکافات کے نتائج سے خوفزدہ رہتے تھے۔ عیسائیت کے کفارے کے عقیدے، اور خود مسلمانوں کے شفاعتِ رسول ﷺ کے عقیدے کی جڑ کٹ گئی ہے۔ ہمارے ہاں سب سے بڑی گالی ہی یہ ہوتی ہے کہ: ''تم قیامت کے دن رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم رہ جاؤ۔'' عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کفارے پر ایمان کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی۔ بالکل عیسائیوں کی طرح ہمارے ہاں بھی حدیث گھڑ لی گئی، بلکہ حدیث کی بجائے روایت کہنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ: ''نجات اعمال سے نہیں ہوتی، شفاعت پر ایمان لانے سے ہوتی ہے''۔ وہی عیسائیت کا عقیدہ لفظ بہ لفظ آپ کے ہاں داخل کر دیا گیا۔

مکافاتِ عمل کے نتائج کا سلسلہ جہانِ فردا تک جاری رہتا ہے۔ قرآن کی رو سے زندگی کا سلسلہ اس سانس کے ساتھ ہی وابستہ نہیں کہ یہ منقطع ہوا، تو زندگی ختم ہوئی۔ نہیں! زندگی مسلسل آگے چلتی ہے۔ اور وہ اسی مقصد کے لیے آگے چلتی ہے کہ قانون مکافات عمل کی رو سے جو نتائج مرتب ہونے ہیں، وہ اگر اِس زندگی میں مرتب نہیں ہوئے ہیں، تو اس سے آگے مسلسل

زندگی چلتی ہے۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ نتائج اس دنیا میں سامنے آئیں یا مرنے کے بعد سامنے آجائیں۔ انسان کے اعمال کے نتائج خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ہوں، ایک فرد کے ہوں یا ایک قوم کے ہوں، ایک نظام کے، ایک مملکت کے اعمال کے نتائج جب سامنے آتے ہیں، تو اسے کہا جاتا ہے یومِ مکافات یا روزِ مکافات یا یومِ قیامت۔ یہ دن اِس زندگی میں بھی آسکتا ہے، موت کے بعد کی زندگی میں بھی آسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے کہا کہ میں روزِ مکافات، اگر کہیں خلاف ورزی ہوگئی ہوگی تو اُس کے نتائج سے خائف ہوں۔

تیسرا باب: انسانی ذات کی بنیادی اور لازمی خصوصیت آزادیِ ارادہ کا تعارف:

قرآن کی رو سے انسان کی جدید تخلیق انسانی ذات کے وجود پذیر ہونے میں دو عناصر کی شمولیت لازمی ہوتی ہے۔

1۔ انسان کا اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی سے انتخاب کرنے کی صلاحیت سے ودیعت ہونا۔

2۔ انسان میں علم کی استعداد کا ودیعت ہونا، جس میں علم الوحی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

مادی نظریۂ حیات میں انسانی طبیعی زندگی کو ہی ارتقاء کی آخری کڑی شمار کر کے مزید انسانی ذات کے حامل ہونے کی ارتقائی حالت سے انکار کیا جاتا ہے۔ آزادیِ ارادہ کا تعلق چونکہ انسانی ذات سے ہوتا ہے، لہٰذا یہاں مادی نظریۂ حیات کی حیوانی زندگی میں نظریہ جبریت کے موقف پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ اِس لئے حکمائے مغرب انسان کی حیوانی زندگی کے ارتقاء تک کے مقام کو نظریہ جبریت اور انسانی ذات کے ارتقاء کے حصول کے بعد کے مقام کو نظریہ آزادیِ ارادہ و اختیار کے تحت زیر بحث لاتے ہیں۔

اِس باب میں ہمارا موضوع نظریۂ آزادیِ ارادہ کو زیرِ بحث لانا ہے۔

ارادہ کا لغوی مفہوم:

الارادہ کے لغوی معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادہ اصل میں اس قوت کا نام ہے جس میں خواہش، ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں۔ پھر اسی سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف مائل ہونا ہے۔ اس فیصلے کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہیے یا نہیں۔

چونکہ الارادہ کے مادہ رود کے بنیادی معنوں میں کسی کام کا حکم اور تگ و دو کا تصور نمایاں طور پر رہتا ہے لہٰذا ارادہ کے معنی کسی چیز کی خواہش یا طلب کے ہوگئے۔ ارادہ اور طلب میں البتہ یہ فرق پایا جاتا ہے کہ طلب تو انسان کی کسی بات پر عمل سے ظاہر ہوجاتی ہے، جبکہ ارادہ کبھی پوشیدہ رہتا ہے اور کبھی ظاہر۔

ارادہ درحقیقت دل کی طرف کھنچنے اور رجحان دونوں کی وجہ سے کسی چیز کی طرف جھکنے کا نام ہے۔ یا یہ ایسے میلان کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں نفع کی توقع ہو۔

ہمیں کسی حالت میں بھی بھولنا نہیں ہوگا کہ قرآن کریم میں جہاں ''خدا کے ارادوں'' کا ذکر آیا ہے، انھیں انسانی

ارادوں کی طرح نہیں سمجھنا چاہیے۔ انسانی ارادے بندھتے بھی ہیں، ٹوٹتے بھی ہیں، صحیح بھی ہوتے ہیں، غلط بھی، قابل عمل بھی ہوتے اور محض ''شاعرانہ'' بھی۔ لیکن خدا کے ارادے درحقیقت اس کے وہ غیر متبدل اور مُطلق فیصلے ہوتے ہیں، جس کے قوانینِ مشیت کے مطابق کائنات کا سلسلہ سرگرمِ عمل ہے۔

فلسفہ میں ارادہ کی اصطلاح کا مفہوم:

فلسفہ میں ارادہ کی اصطلاح کا مفہوم مختلف پیرائے میں یوں بیان کیا جاتا ہے۔

1۔ انسان بالارادہ ایک ہی جیسے حالات میں مختلف انداز سے عمل کرسکتا ہے۔

2۔ آزادی عمل کا انشاء وصدور فرد کی داخلی کیفیات (ارادہ) سے ہوتا ہے۔

3۔ ارادہ، عضویاتی، اعصابی، نفسیاتی یا ماحولیاتی مہیجات سے آزاد ہے۔

4۔ ارادہ ایک ملکہ یا قوت ذہنی ہے جو متبادلات یا ماحولی معتقدات سے آزاد ہے۔

5۔ بلا جبر واکراہ پسند اور انتخاب کرنے کا احساس ہے۔

6۔ یہ احساس کہ دیئے ہوئے حالات دوبارہ وقوع پذیر ہوں تو میں اس سے مختلف انداز میں عمل کروں جیسے پہلے کیے تھے۔

7۔ یہ احساس کہ میرے سامنے متبادلات کھلے ہیں اور میں ان میں کسی کا بھی انتخاب کرسکتا ہوں۔

8۔ انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں انتخاب کی پوری آزادی ہے۔ اس کا ارادہ داخلی یا خارجی قوتوں سے متاثر نہیں ہوتا اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔

فلسفہ میں نظریہ آزادی اختیار و ارادہ کا مسئلہ اس لیے اہمیت اختیار کر گیا کہ انسان کے اپنے اعمال میں پابندی کے سائنسی نکتہ نگاہ سے اخذ کئے گئے نظریہ جبریت کو اپنانے سے درج ذیل مسائل کا تشفی بخش حل حاصل نہیں ہوتا کہ:

1۔ اگر انسان اپنے اعمال میں پابند ہے تو پھر روزمرہ کی عملی زندگی میں استعمال ہونے والے لفظ مثلاً تعریف وتنقید، سزا جزا کی ذمہ داری، فرائض اور حریت کو کیا معنی پہنائے جاسکیں گے؟

2۔ اگر انسان اپنے عمل میں پابند ہے تو اس کے احساسِ حریت کی کیا توجیہہ ہوسکے گی۔

اِن مسائل کے حل کے لئے ہمیں کانٹ کی زبان میں عقلِ علمی کی جگہ عقلِ عملی کے استعمال سے انسانی نظریہ آزادی و اختیار پر ایمان لانے ہی سے ہی تشفی بخش جوابات حاصل ہوسکتے ہیں۔

ارادہ کی نفسیاتی ماہیئت:

نفسیات کے حکمائے قدیم ''ارادے'' کو ایک قوت سمجھتے ہیں جو انسان میں مخفی طور پر مندرجہ ذیل چار حالتوں میں کارفرما ہوتا ہے:

1۔ جب کسی فعل کے لیے دو متصادم محرکات (Motives) موجود ہوں اور دونوں پر بیک وقت عمل پیرا ہونا ناممکن ہو تو

ہمارا ارادہ فیصلہ کرتا ہے کہ دونوں میں کس پر عمل کیا جائے۔ اسے ارادے کے انتخاب کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔

2۔ جب ہم کسی فکر (thought) پر توجہ یا فعل میں مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں تو ارادہ سعی کے ساتھ ان مشکلات پر قابو پالیتا ہے۔

3۔ جب ایک شخص کسی مقصد یا نصب العین کی خواہش رکھتا ہے، تو اِس کے حصول میں ارادہ اسے جدوجہد کے لیے مجبور کرتا ہے۔

4۔ جب انسان ایک فعل کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو ارادہ جسم کو ذہن کے فیصلے کی تعمیل کے لیے مجبور کرتا ہے۔

حکمائے نفسیات ارادہ کی مزید وضاحت کے لیے اِسے اختیاری افعال اور ارادی اعمال میں تقسیم کرتے ہیں۔

1۔ اختیاری افعال (Voluntary Actions): وہ کہ جن افعال میں، ارادہ، شعور اور انتخاب نہیں پایا جاتا ہے۔

2۔ ارادی افعال (Volitonal Actions): وہ کہ جن اعمال میں، ارادہ، شعور اور انتخاب پایا جاتا ہے۔

نفسیاتی اختیاری افعال و ارادی اعمال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے حکمائے نفسیات فرماتے ہیں کہ نفسیات میں ہر اس فعل کو اختیاری فعل کہا جاتا ہے جسے ہم اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی قدرت رکھتے ہوں۔ اختیاری فعل کے متعلق یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ ہم چاہیں تو اسے کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔

غیر اختیاری افعال کو فعل اور ارادی افعال کو عمل بھی کہا جاتا ہے اور دونوں کے معنی ''کام کرنے'' کے ہیں۔ مجبور اشیائے کائنات کے ''کام کرنے کو قرآن میں بھی ''فعل'' کہا جاتا ہے۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿16:50﴾، اور انسان کے ''کام کرنے'' کے لئے قرآن میں ''عمل'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ انسان کے کام کرنے سے متعلق لفظ اعملوا، اعملوا سے قرآن بھرا پڑا ہے۔

ارادی عمل کی اہلیت کے حصول میں چند شرائط کو پورا کرنا لازمی ہوتا ہے۔

1۔ پہلی شرط یہ ہے، کہ کام بالارادہ ہو، حتیٰ کہ جو کام عادتاً کیے جائیں، عرب انہیں بھی عمل نہیں کہتے۔

2۔ دوسری شرط یہ ہے کہ کام التزاماً ہو، مسلسل ہو۔

3۔ جو کام بھی ہنگامی طور پر کیا جائے، خواہ بالارادہ ہی کیوں نہ کیا ہو، عرب اس کو بھی ''عمل'' نہیں کہتے۔

4۔ جو رسومات، مذہب کی دنیا میں، عادتاً اور تقلیداً ادا کی جاتی ہیں، زبان کے اعتبار سے، ان کو عمل نہیں کہا جائے گا۔ مذہب کی جو رسم عادتاً یا تقلیداً ادا کی جائے گی، وہ ''عمل'' کے زمرہ میں نہیں آتیں، تو نہ ان کا گناہ ہے، اور نہ ثواب ہے۔

5۔ اشیائے کائنات کے ''کام کرنے'' کو یعملون نہیں کہا گیا، کیونکہ یہ تو کچھ بھی بالارادہ کرتے ہی نہیں ہیں۔ جس راستے پر انہیں لگا دیا گیا ہے، سر جھکائے اس پر چلتے رہتے ہیں۔

6۔ اختیاری افعال میں ہماری بیشتر حرکات اور افعال (انعکاسی، عادی اور جبلی) اختیاری ہوتی ہیں اگرچہ ان میں

ہمارے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ وہ اختیاری اس لیے ہوتی ہیں کہ ہم انھیں جس طرح چاہیں کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو روک بھی سکتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو تیز روشنی میں آنکھیں نہ جھپکیں۔ اس لحاظ سے آنکھ جھپکنے کی حرکت اختیاری ہے۔ لیکن چونکہ اس حرکت میں ہمارے ارادے اور انتخاب کو دخل نہیں ہوتا لہٰذا یہ حرکت لاشعوری اور میکانکی طور پر ہوتی رہتی ہے۔

7۔ ان تمام اعمال کو جو ان اشیاء سے صادر ہوتے ہیں جن میں ارادہ ءشعوری کا وجود نہیں یا وہ انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں دونوں اخلاقی اعمال کے زمرے میں نہیں آتے۔

8۔ اس لیے کہ اخلاقی حکم کا فیصلہ صرف اختیاری اعمال پر ہی صادر ہوسکتا ہے۔ اور جب تک ارادہ نہ پایا جائے، اخلاقی حکم کا نظریہ ان پر لاگو نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے موضوع سے خارج از بحث ہوجاتا ہے۔

مادی نظریہِ حیات میں انسان کی طبیعی زندگی کو ہی اِس دنیا میں ارتقاء کی آخری کڑی سمجھنے والے انسانی ذات سے انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے نظریہ میں انسان کی حیوانی زندگی کے متعلق نظریہ جبریت کی حکمرانی کے موضوع پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ اِن کے برعکس انسانی ذات پر ایمان رکھنے کے مقام پر فائز آزادیِ ارادہ و اختیار کی صلاحیت کے حامل ہو کر البتہ نظریہ جبریت کا ابطال کرتے ہیں۔

اِن دونوں اختیاری افعال اور ارادی اعمال کے نظریات کو مسلمانوں کی تاریخ کے علمُ الکلام کا اہم موضوع کے طور پر جبریہ اور قدریہ سے منسوب کر کے بیان کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ میں مسئلہ جبر وقدر کے مباحث:

نظریہ جبر وقدر ایک الٰہیّاتی مسئلہ کے طور پر مسلمانوں کی تاریخ میں علمُ الکلام کا موضوع رہا ہے۔ اس کا یہاں مُختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

تاریخِ اسلام میں علم الکلام کے موضوع کے تحت مُسلمانوں میں دو فرقے اہمیت رکھتے ہیں۔

1۔ فرقہِ جبریہ

2۔ فرقہِ قدریہ

فرقہِ جبریہ:

نظریہِ جبریت کا مؤقف:

نظریہ جبریت سے مراد ایک عمومی فلسفیانہ عقیدہ ہے کہ ہر وہ شے جو وقوع میں آئے، اس سے وابستہ ایسی شرائط/اسباب ہیں کہ اگر وہ پوری ہوں تو اس کے علاوہ کچھ وقوع نہیں ہوسکتا جیسا کہ ہوا۔

لہٰذا جب بندے سے کوئی حرکت صادر ہوتی ہے تو اس میں چار امکانات پائے جاتے ہیں۔

1۔ وہ حرکت بقوتِ خداوندی صادر ہوتی ہے۔

2۔ صِرف بندے کی قُدرت اس کی مؤجب ہے۔

3۔ وہ فعل دونوں کی قدرت سے انجام پاتا ہے۔

4۔ اللہ تعالیٰ اور بندہ دونوں کی قدرت کو اس میں دخل نہیں۔

اِن میں امکانات کی تیسری اور چوتھی دونوں کی قدرت کی شکل کو یکسر مسترد کر دیا جاتا ہے۔

جبریہ کا اِن امکانات میں سے حرکت بقوتِ خداوندی کی قسم اوّل کے قائل ہونے کا واضح موقف سامنے آتا ہے۔

جبریہ کا مرکزی نقطۂ نظر یہ تھا کہ بندے سے افعال کی نفی کر کے انہیں ذاتِ خداوندی کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ کیونکہ بندہ میں استطاعت نہیں پائی جاتی۔ وہ تو اپنے افعال میں مجبورِ محض ہیں۔ نہ اس میں قدرت پائی جاتی ہے نہ ارادہ اور اختیار۔ لہٰذا اُنہوں نے الٰہیّاتی مسئلہ کی انسان کے خودمختار ہونے کے مفروضہ کی دوسری بنیادی قضیہ کی شرط کی نفی کر دی۔ منطقی طور پر نتائج کے اخذ کرنے میں مفروضوں کے دونوں قضیوں کا وجود میں رہنا لازم ہوتا ہے ورنہ نتائج تو رہے ایک طرف اس الٰہیّاتی مسئلہ کو زیرِ بحث لانے کے جواز ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جبریہ کوئی موقف اختیار کرنے میں عقل سے نہیں بلکہ نقل پر انحصار کرتے تھے۔ بندے سے اعمال کی قدرت کی نفی کرنے کے موقف سے بندہ منطقی طور پر اعمال کے لئے جوابدہ ہی نہیں رہتا اور اس طرح اللہ کے نظامِ مکافاتِ عمل کے باقی رہنے کا جواز ہی نہیں رہتا۔ جب اُن کی توجہ اِن نتائج کی طرف مبذول کرائی جاتی تو وہ منطقی طریقۂ کار سے مرتب اصولوں کی بنا پر اپنے آپ کو جوابدہ نہیں سمجھتے تھے۔ اسلاف سے جو مبینہ طور پر بتایا جاتا، اُس پر عقلی دلائل سے غور و فکر کو معیوب گردانتے ہوئے اپنے نقلی دلائلِ عقائد میں مگن رہا کرتے۔

مُسلم ہسٹری میں نظریہ جبریت کو جبریہ اور نظریہ آزادیِ ارادہ کو قدریہ فرقہ سے منسوب کر کے دونوں میں آویزش کے بیان کو اہمیت حاصل رہی ہے، لہٰذا اس کے مُختصر جائزہ سے بحث کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

نظریہِ جبریت میں انسانی ذات سے آزادیِ ارادہ کی نفی:

انیسویں صدی میں خصوصی طور پر سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ کائنات کے ہر شعبے پر میکانکی سائنس کے اصول حاوی ہیں۔ نہ صرف مادی دنیا علت و معلول کے سلسلے میں بندھی ہوئی ہے بلکہ روحانی دنیا/انسانی ذات بھی اس کی پابند ہے۔ سائنس میں علت سے معلول کی طرف جاتے ہیں اور معلول سے علت کی طرف، یہ سلسلہ کہیں بھی نہیں ٹوٹتا۔ لہٰذا آزادی کا سوال مادی دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کوئی مشین یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ اپنی مرضی سے حرکت کرتی ہے۔ اس طرح اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرے کہ وہ آزاد ہے تو وہ گویا اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ اس کے اعمال و افعال بھی ویسے ہی میکانکی قوتوں کے زیر اثر ہیں جیسے مشین کی حرکت۔ اس نظریہ کے مطابق نفس انسانی بھی مادہ ہی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

اسی نظریہ مادیت پر مبنی نظریہِ جبریت کی رو سے کسی ایک معین وقت پر مادی دنیا بشمول نفس انسانی کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اس کی کیفیت سے پہلے کی قوتوں کے امتزاج اور تقسیم کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔اس مادی دنیا کی کائنات میں نہ کوئی نیا عنصر یا نئی قوت (جس میں ارادہ بھی شامل ہے) وجود میں آتی ہے (اور نہ ہی ایسا ہوسکتا ہے) اور نہ اس قسم کا کوئی عنصر یا قوت خارج سے کائنات میں داخل ہوتی ہے۔اس لیے ہم جس چیز کا نام ایک ''نیا عنصر'' رکھتے ہیں وہ موجود قوتوں کی ایک نئی ترتیب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔مادیت کے اس ادعا کو جبریت (Determinism) کہتے ہیں اور اس میکانکی تصور کی رو سے مادی دنیا کے تمام افعال، علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے متعین ہیں۔

جس طرح ایک مشین متعین قواعد کے ماتحت نقل و حرکت کرتی جاتی ہے، اسی طرح یہ تمام کائنات قوانین فطرت کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔اس سلسلہ نقل و حرکت میں ہر عمل پچھلے سبب (Cause) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ہمارا حساب اگر درست ہے تو ہم ہزار سال پہلے بتا سکتے ہیں کہ فلاں دن، فلاں وقت سورج گرہن میں آجائے گا، اس لیے یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہو رہا ہے۔چونکہ اس نظریہ میں یہ وقوعہ معین ہے، لہٰذا آزادی ارادہ کا حامل ہونا ناممکن ہے۔

لہٰذا نظریہِ جبریت یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ معین ہے۔انسانی اختیار کے مسئلہ کے ضمن میں ''معین ہونا''، ''سبب'' ہونے کے مترادف ہے۔اس طرح جبریت یہ کہتی ہے کہ ہر چیز جو واقع ہوتی ہے سبب رکھتی ہے۔لفظ ''جبریت'' کچھ ناسازگار سا لگتا ہے کیونکہ اس کے مفہوم میں ایک ایسا پہلو ہے جو سبب بننے یا ہونے میں نہیں ہوتا۔اگر آپ سے کوئی یہ کہے کہ ''آپ کے ہر عمل کا کوئی سبب ہوتا ہے'' تو آپ کو حیرت نہیں ہوگی۔لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ''آپ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے آپ مجبور ہیں'' تو آپ اس سے غیر متفق ہونے کے طرف مائل ہوں گے کیونکہ ''جبر'' کے لفظ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کرنا چاہیں یا نہ چاہیں اس کے باوجود کوئی عمل آپ سے سرزد ہوتا ہے۔لیکن جبریت یہ نہیں کہتی۔جبریت محض ایک کلی علیت کا نظریہ ہے جو صرف یہ کہتا ہے کہ ہر وقوعہ کا ایک سبب ہوتا ہے، یہ اس بات کی تشریح نہیں کرتا کہ سبب ذہنی ہے یا طبیعی۔جہاں تک جبریت کا تعلق ہے سبب کچھ بھی ہوسکتا ہے۔یہ بھی لازمی نہیں کہ ہم وقوعات کے اسباب جان لیں۔یہ صرف اتنا کہتا ہے کہ ہر وقوعہ کا ایک سبب ہوتا ہے خواہ ہم اسے کبھی نہ جان سکیں۔

نظریہ جبریت کے تحت تقدیریت کو بھی زیرِ بحث لایا جاتا ہے، جس میں جبر کے پہلو پر زیادہ شدت سے زور دیا جاتا ہے۔

ارسطو کا نظریہ جبر بالذات:

عام طور پر حکمائے مغرب جبر بالذات کے قائل ہیں۔یہ نظریہ سب سے پہلے ارسطو نے پیش کیا تھا، اس نظریہ کے مطابق ہمارے اعمال پر کسی بیرونی طاقت کا جبر نہیں ہوتا بلکہ وہ ہماری اپنی ہی ذات کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں یعنی ان پر کوئی بیرونی جبر نہیں بلکہ صرف اندرونی جبر ہوتا ہے۔بالفاظ دیگر ہمارا ارادہ ہماری ذات سے مجبور اور اس پر منحصر ہوتا ہے۔لہٰذا آزادی سے مراد محض خارجی جبر سے آزادی ہے۔خود مختار یا آزاد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے علاوہ کسی اور

چیز سے مجبور نہیں۔

نفسیات دانوں کے علاوہ حکمائے مغرب میں ارسطو کے اسی نظریہ کے تحت جدید حکمائے مغرب میں ہابس (Hobbes) بھی مادیت پسند ہونے کے باعث قدر و اختیار کا منکر اور جبر مطلق کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے آزادیِ اختیار کا خیال لغو ہے۔ انسانی ارادے یا خواہش کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اس کے خیال میں انسان جس بات کا ارادہ کرتا ہے اس پر عمل کرنے میں وہ آزاد ہے لیکن ارادہ کرنے میں مجبور محض ہے۔

ارسطو کا یہ نظریہ کہ ہمارے افعال پر کسی بیرونی طاقت کا جبر نہیں ہوتا، بلکہ صرف اندرونی جبر ہوتا ہے، کو جدید نفسیات دانوں نے بھی اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے اس موضوع کو عام طور پر درج ذیل علوم کے تحت زیر بحث لایا گیا ہے۔

1۔ جبر بالذات علم الحیات کی رو سے۔

2۔ جبر بالذات علم الانسان کی رو سے۔

3۔ جبر بالذات علم النفسیات کی رو سے۔

1۔ جبر بالذات علم الحیات کی رو سے:

اس علم کی رو سے انسانی عادات و خصائل کے نقوش بچے کو نفسیاتی طور پر نہیں ملتے بلکہ جس طرح ایک بچہ مادہ تولید کی وساطت سے اپنی رنگت و خط و خال، ماں باپ سے وراثت میں لیتا ہے اسی طرح اسے مادی طور پر ایسے اجزاء وراثت میں ملتے ہیں جنھیں جینز (Genes) کہا جاتا ہے اور جن سے اس کا مزاج (Temprament) ترتیب پاتا ہے۔

اس نظریہ میں اب ذرا سی تبدیلی ہوگئی ہے جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ یہ اجزاء تولیدی درحقیقت خام مسالہ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ پر ماحول کا بھی اثر ہوتا ہے۔ یعنی بچہ کا مزاج مرکب ہوتا ہے وراثتی مسالہ اور ماحول کے اثرات کا اور یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا ہے۔

اس میں ایک مکتبِ فکر کا خیال ہے کہ وراثت کے نقوش انمٹ ہوتے ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں۔ ان نقوش کو ماحول کی تبدیلی سے بدلا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماحول اور وراثت کے نقوش و خصوصیات میں کوئی امتیاز نہیں۔ انسان کی ہر ایک عادت اور خصوصیت میں وراثت اور ماحول دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔

2۔ جبر بالذات علم الانسان کی رو سے:

حکماء کے نظریات علم الحیات کے بعد ''علم الانسان (Anthropology) کے حکماء سامنے آئے۔ انھوں نے کہا کہ انسانی بچے کے ذہنی نقوش، معتقدات و تصورات وغیرہ انفرادی چیز نہیں ہیں بلکہ نسلی (Racial) ہیں۔ ہر فرد کسی نہ کسی نسل سے متعلق ہے جس کی ابتداء قبائل سے ہوتی ہے۔ نسلی معتقدات و تصورات وراثتاً آگے منتقل ہوتے رہتے ہیں اور انہی کے مجموعی تاثرات کا نام ایک فرد کے ذاتی خصائص و رجحانات ہیں۔

3۔ جبر بالذات علم النفسیات کی رو سے:

علم النفسیات میں یہ نظریہ کرداریت (Behaviourism) کا ہے جس کا امام ڈاکٹر واٹسن ہے۔ اُس نے اپنی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ جسے ہم نفسِ انسانی کا فیصلہ (Choice) کہتے ہیں، وہ درحقیقت آزاد فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ مجموعی نتیجہ ہوتا ہے، ان تمام محرکات (Stimulii) کا جو بچے کے (نفس) ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے اس کی عادات وخصائل مرتب ہوتے ہیں۔ پھر یہ عادات وخصائل نسلاً بعد نسل بطور وراثت منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اسطرح غیر شعوری طور پر مسلمات یا معتقدات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بنابریں جس چیز کو عام طور پر نفسِ انسانی کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ ان ہی محرکات کا طبیعی نتیجہ ہوتا ہے۔

اس شاخ کے حکماء میں فرائڈ، ایڈلر اور ینگ مشہور ہیں۔ ڈاکٹر واٹسن کے نزدیک یہ بحث ہی بے معنی ہے کہ نفس انسانی (Human Mind) الگ مستقل وجود رکھتا ہے یا نہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنا الگ مستقل وجود رکھے یا نہ رکھے جب وہ انسانی معاملات میں آزاد دخل نہیں دے سکتا تو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔

علمائے نفسیات کے مطابق ایک نفس کی دو کیفیّتیں یا دو حالتیں ہوتی ہیں:

1۔ نفس شعوریہ Consious Mind

2۔ نفسِ غیر شعوریہ، یا تحت الشعور Unconscious Mind

علمائے نفسیات کے نزدیک نفسِ غیر شعوریہ بہت زیادہ اہم ہے۔ اسے وہ Master of the man's Personality کہتے ہیں۔ وہ مثال دیتے ہیں کہ سمندر میں جو یہ برف کا پہاڑ (آئس برگ) نظر آتا ہے، اس کا جتنا حصّہ اوپر ایک چٹان کی شکل میں نظر آتا ہے، وہ نظر آنے والا حصہ اس سارے کا صرف (1:10) حصّہ ہوتا ہے، جبکہ اس برف کے پہاڑ کا (9:10) حصّہ نیچے پانی میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ پانی سے اوپر نظر آنے والے آئس برگ کو، جو تم انسان کی پرسنیلٹی کا شعور یا Consious Mind کہہ رہے ہو، وہ تو بہت ہی تھوڑا یعنی (10:1) حصّہ ہے جبکہ باقی (10:9) حصّہ تو انسان کا تحت الشعور Unconsious Mind ہوتا ہے۔ یہ انسان کی پرسنیلٹی کا وہ سٹور ہے، جس کے اندر یہ سارے احساسات، جذبات اور آرزوئیں ہوتی ہیں جو پوری ہونے سے رہ گئیں۔ ان کی وجہ سے تکالیف کو غالبؔ ''ناکردہ گناہوں کی سزا'' کہتا ہے۔ یہ نامرادیوں کی ایک پوری دنیا، اور پھر وہ تمام عقل فریب کار کے جواز کی الجھائی ہوئی سی چیزیں ہوتی ہیں، جس میں شعور Consious Mind نے تحت الشعور Unconsious Mind یا نفس غیر شعوریہ کو فریب دیا ہوتا ہے۔

قرآن نے وضاحت کی ہے کہ انسانی نفس کی دو کیفیات ''شعور اور لاشعور'' ظہور نتائج کے وقت آپس میں جھگڑیں گے نفس غیر شعوریہ، اپنے فریضہ کے طور پر اصل حقیقت یا اصل بات کو اپنے سٹور میں جمع کر لیتا ہے۔ جمع کر لینا نفس غیر شعوریہ کا، فریضہ ہے۔ اسی کو قرآن نے ''نفس غیر شعوریہ کے اندر مضمر، پوشیدہ حقائق'' کہا ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۙ (86:9)

''اس دن، اس کے اندر یعنی نفس غیر شعور یہ کے اندر چھپی ہوئی چیزیں باہر آ جائیں گی''۔

يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (16:111)

ظہور نتائج کے وقت ایسی تباہی ہوگی، جس کو دیکھ کر ہر غلط روش، خود اپنے آپ سے جھگڑنا شروع کر دے گا (کہ میں نے یہ کیوں کیا)؟ جو کچھ کسی کو پیش آئے گا، وہ اُس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ کسی پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

ہیوم کا نظریہ جبر:

یہ مسلّم امر ہے کہ کائنات فطرت کا ہر معلول اپنی اپنی علت کی قوت کا اس طرح پابند ہوتا ہے کہ اس کے سوا اس سے کوئی اور معلول ظاہر ہی نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہم کو سوچنا چاہیے کہ فطرت کائنات کے متعلق وجوب (Necessary) کا یہ تصور ہمارے اندر کہاں سے اور کیوں کر پیدا ہوتا ہے۔

ہیوم نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وجوب وتحلیل کا تصور تمام تر اس یکسانی ومماثلت سے حاصل ہوتا ہے جو مختلف افعال فطرت میں ہم کو نظر آتی ہے جہاں ایک طرح کی چیزیں ہمیشہ ایک دوسرے سے ملحق ملتی ہیں اور ذہن بر بنائے عادت ایک کے ظہور سے دوسرے کو مستنبط کرنے پر منحصر ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ یکساں چیزوں کے الحاق اور اس الحاق سے لازمی طور پر ایک دوسرے کے استنباط کے ماوراء وجوب یا وابستگی کا ہم کوئی اور تصور نہیں رکھتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر قوم اور ہر زمانے میں انسان کے افعال میں یک رنگی پائی جاتی ہے اور اصولی طور پر فطرت (جبلت) انسانی ایک ہی طرح کے (جبلی) محرکات سے ایک ہی نہج پر عمل کرتی ہے اور انہی کے محرکات واعمال نفسی کی عالم گیر یک رنگی کے بھی ہم اس طرح قائل ہیں جس طرح کے افعال جسم کی یکسانی کے۔

یہی وجہ ہے کہ جسم کے افعال وخواص کی طرح فطرت انسانی کے علم میں بھی ہم اپنے گزشتہ تجربات زندگی سے اپنی عملی وفکری زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور اس رہنمائی کی بدولت آدمی کے افعال، حرکات وسکنات اور آثار بُشرہ سے ہم اس کے اندرونی محرکات ومیلانات تک پہنچ کر ان کی تشریح وتوجیہ کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر انسان کے افعال میں یک رنگی کا سرے سے پتہ نہ ہو اور ہمارا ہر تجربہ دوسرے سے الگ اور بے تعلق ہو تو فطرت انسانی کے متعلق کوئی عام اصول قائم کرنا بالکل ناممکن ہوتا اور کوئی تجربہ چاہے وہ کتنا ہی صحیح مشاہدہ پر مبنی ہو، بجائے خود کسی مصرف کا نہ ہوتا۔

ہیوم مانتا ہے کہ ہم کو بعض ایسے افعال بھی نظر آ سکتے ہیں جو بظاہر کسی معلوم محرک سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور جو عادات و اخلاق کے تمام مقررہ اصول سے مستثنیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی وضاحت میں البتہ وہ فلاسفہ کا رویہ بیان کرتا ہے کہ کائنات کی تقریباً ہر چیز میں بہت سے ایسے اصول ومبادی پوشیدہ ہیں جو غایتِ بُعد کی وجہ سے نظر نہیں آتے، کم از کم اس امکان کی

گنجائش ضرور رکھتے ہیں کہ فرق معلومات کا سبب ممکن ہے کہ علت کی بے راہروی کے بجائے بعض مخفی موانع کی موجودگی ہو۔اس لیے جب مزید مشاہدات اور زیادہ دقیقہ سنجی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اختلافِ معلولات کی تہ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی اختلاف علت موجود ہوتا ہے اور ایک کا فرق دوسرے کے فرق پر مبنی ہوتا ہے تو یہ امکان یقین سے بدل جاتا ہے۔غرض اس طرح کی کئی مثالوں کے مشاہدہ سے فلاسفر یہ اصول قائم کر لیتے ہیں کہ تمام علل و معلولات ایک دوسرے سے اٹل طور پر جکڑے ہوئے اور قطعاً غیر منفک ہیں اور کسی معلول میں کوئی فرق نظر آتا ہے تو اس کا سبب کوئی نہ کوئی مخفی مانع یا کسی مخالف علت کی مزاحمت ہے۔

اسی اصول سے ہیوم نے اپنے انسانی اختیار میں جبری نظریہ اخذ کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ فلسفی یہی دلیل انسان کے ارادی افعال وعوامل پر چسپاں کرے گا تو اس کے بے جوڑ سے بے جوڑ افعال وحرکات کی بسا اوقات وہ لوگ بآسانی توجیہہ کر سکتے ہیں جو اس کی سیرت کے تمام کوائف وجزئیات سے آگاہ ہیں۔انسان کی سیرت میں کسی حد تک تناقض وتلوّن پایا جانا بھی فطرت انسانی کا ایک مستقل اصول ہے۔یہ تناقض واختلاف زیادہ تر ان اشخاص میں پایا جاتا ہے جن کے اخلاق کا سرے سے کوئی بندھا ہوا قانون بھی نہیں ہوتا۔اس سے ہیوم یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ افعال انسانی ان کے گزشتہ تجربات ہی پر مبنی ہوتے ہیں اور جس کی وضاحت میں وہ درج ذیل دلیل پیش کرتا ہے:

ہر جماعت میں انسان ایک دوسرے کا اس طرح محتاج ہوتا ہے کہ بمشکل ہی اس کا کوئی ایسا فعل نکل سکتا ہے جو تمام تر مستقل بالذات ہو یا دوسروں کے افعال سے قطعاً کوئی واسطہ نہ رکھتا ہو۔جس نسبت سے لوگوں کے معاملات وتعلقات وسیع ہوتے جاتے ہیں اسی نسبت سے وہ دوسروں کے ارادی افعال کو اپنی زندگی کا جزو بناتے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے ارادی افعال ہمارے ارادی افعال کی معاونت کریں گے۔ان تمام استنباط کا ماخذ اسی طرح گزشتہ تجربہ ہوتا ہے جس طرح کہ اجسام خارجی سے متعلق استدلال کا اور اس طرح آدمی کامل طور پر اس کا یقین رکھتا ہے کہ بے جان عناصر کی طرح انسان سے بھی آئندہ اسی قسم کے افعال کا ظہور ہوگا جن کا پہلے ہو چکا ہے۔یہ اس لیے کہ انسان کے تمام اعمال و افعال اپنے محرکات اور مخصوص حالات کے ساتھ ایک ایسا بندھا ہوا (جبریہ) الحاق ورابطہ رکھتے ہیں جس کی بنا پر ہم ایک کا دوسرے سے استنباط کرتے ہیں۔

حکمائے مغرب انسان کے آزادیِ ارادہ واختیار کو اپنے نظری/سائنسی علم سے ثابت نہیں کرتے، بلکہ اِس کے لئے وہ علمُ الاخلاقیات کا سہارا لیتے ہیں، لہٰذا اب ہم یہاں اخلاق پر مبنی ارادی اعمال کی تفصیل سے وضاحت کرنے کا آغاز کر رہے ہیں اور مناسب سمجھتے ہیں کہ پہلے جبری افعال کی تردید میں دلائل دئے جائیں۔

(جاری ہے)

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 8

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

آج ویک اینڈ ہے اور سارا خاندان ڈرائنگ روم میں موجود ہے سوائے شکیل الزماں کے جو کرکٹ میچ کھیلنے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔ کلیم الزماں بائی دی وے اپنے نسخۂ کیمیا کی تعریف کر رہے ہیں کہ پروردگار نے انسان کو کتنی چھوٹ دے دی ہے کہ اگر برائی کر بیٹھو تو جلدی سے نیکیاں کر ڈالو۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (11:114)۔ کہ اتنے میں شکیل الزمان کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر کلیم الزماں کہتے ہیں۔

کلیم الزماں: کیوں بیٹا جی! میچ ہار آئے ہو۔ میں نہ کہتا تھا کہ کوئی بھی کام کرنے کے لئے مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ٹیم روزانہ پریکٹس نہ کرے تو باجماعت نمازیں پڑھنے سے میچ جیتے نہیں جاسکتے۔

شکیل الزماں: ابو! آپ کو نماز پر کیوں اعتراض ہے؟

کلیم الزماں: بیٹا! میں نماز پر اعتراض نہیں کر رہا۔ میں اس تصور پر اعتراض کر رہا ہوں جو تمہاری ٹیم نے میچ کے ساتھ وابستہ کر رکھا ہے۔ میرے خیال میں نماز تو ایسی مفید چیز ہے جس کی افادیت سے مسلمان ایک ہزار سال سے بے خبر ہے۔ نماز تو مسلمانوں کے پاس ایسی پراپیگنڈا مشین ہے جو دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ پراپیگنڈا کے لفظ کو لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ کسی تصور کو عام کرنے کا ذریعہ ہے اور جدید اسلامی تصورات کو اگر قبول عام حاصل ہوا تو مساجد کے ذریعہ ہوگا جہاں مسلمان پانچ وقت نماز کے لئے اکھٹے ہوتے ہیں۔ مسجد کا ذکر جو آیا تو عالم آرا نے سوال کر دیا کہ آپ پچھلے جمعہ جو مسجد میں گئے تھے تو آپ کا جوتا محفوظ رہا یا بدل گیا۔ بیٹی خیریت ہی رہی کیا کیا جائے۔ قوم کا اخلاق اتنا بگڑ چکا ہے کہ لوگ مسجد میں بھی چوری کرنے سے باز نہیں رہتے۔ ہم نے ایک صاحب کے متعلق سنا ہے کہ وہ جب بھی صبح سویرے مسجد میں آتے تو ان کے ہاتھوں میں ایک پنجرہ ہوتا تھا۔ جس میں شاید ایک تیتر ہوتا تھا اور پنجرے پر کپڑے کا غلاف پڑا ہوتا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کبھی کبھار ایک جوتا بھی پنجرے میں رکھ لیتے تھے۔

عالم آرا: ابو! آپ کی مہم کیسی رہی؟

کلیم الزماں: بیٹی! نوجوان طبقہ ملائیت سے نالاں ہے۔ چند نوجوانوں نے علامہ پرویز سے ملنے کی خواہش کی تو میں نے انہیں بتایا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں لیکن الیکٹرانک ذرائع سے ان کے دروس محفوظ کر لئے گئے ہیں جو کسی بھی طلوع اسلام کی ویب سائٹ پر سنے اور دیکھے جاسکتے

ہیں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ اگر انہوں نے علامہ اقبال کی شاعری یا علامہ پرویز کے دروس سے صرف ذہنی طور پر لطف اندوز ہونا ہے تو اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ تو ایسے ہی ہے کہ دیوان غالب پڑھ کر حظ اٹھا لیا، یا آل پاکستان مشاعرہ میں واہ واہ کر لی۔ جب تک دل پر چوٹ نہ لگے، جب تک اللہ تعالیٰ کے کلام کی عظمت اور جلال سارے جسم میں تھرتھراہٹ پیدا نہ کر دے، جب تک کلام الٰہی کو سمجھنے کے بعد رونگٹے کھڑے نہ ہو جائیں بات نہیں بنتی۔ میں ان سے گفتگو کر رہا تھا تو ایک نوجوان نے کہا، کہ ہم نے سنا ہے کہ پرویز صاحب پر کفر کا فتویٰ لگا تھا تو میں نے انہیں بتایا کہ کفر کا فتویٰ تو علامہ اقبال پر بھی لگا تھا اور سر سید احمد خان پر بھی لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یہ کہنے کا حق ہے کہ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے نماز جمعہ پڑھی ہے اس سے کیا حاصل ہوا ہے۔ ایک نوجوان نے کہا کہ دل کو تسلی ہوئی ہے کہ ایک فرض ادا ہو گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ نماز جمعہ کی اہمیت کے پیش نظر صرف مبہم سی تسلی کافی نہیں کچھ اور بھی ملنا چاہیے تھا۔ ایک نوجوان نے کہا کہ آپ بتائیں کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا ملنا چاہیے؟

عالم آرا: ابو! آپ کی باتوں کا کسی نے برا تو نہیں منایا؟

کلیم الزماں: بیٹی! آج کا نوجوان ایک ایسی بھیڑ کی طرح ہے جو اپنے گلے سے بچھڑ گئی ہو اور اسے راستہ کی تلاش ہو۔ میں نے انہیں علامہ اقبال کا شعر سنایا۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

ہمارے ہاں ایک ہزار سال بلکہ اس سے بھی پہلے سے روایت چلی آ رہی ہے کہ لوگ نہا دھو کر جامع مسجد کا رخ کرتے ہیں۔ جمعہ کی نماز کی دو رکعت ختم ہوتے ہی لوگ دروازے کی طرف بھاگتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جمعہ کا خطبہ سننے کے لئے باادب مسجد میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ امام جو خطبہ پڑھتا ہے نمازی خاک نہیں سمجھتے کہ وہ خطبہ میں کیا کہہ رہا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کو خود بھی خطبہ کے معنی نہیں آتے۔ اگر اس روایت میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے تو کیا حرج ہے۔ لیکن ملا کا منجمد دماغ کسی بھی تبدیلی کو جائز نہیں سمجھتا اور اگر کوئی تبدیلی پر اصرار کرے تو کفر کا فتویٰ تو ہے ہی ملا کے پاس (ریڈی میڈ) امریکہ میں یورپ کے کئی ملکوں میں ماہرین مختلف موضوعات پر کمیونٹی سنٹروں میں تقاریر کرتے ہیں اور ان کا لیکچر سننے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے۔ اگر ہمارے ہاں یہ روایت چل پڑے تو شہر کی ہر جامع مسجد میں کوئی استاد یا کوئی ماہر فن مفید معلومات پر گفتگو کرے تو کیا حرج ہے۔ موضوعات لاتعداد ہیں۔ حفظان صحت پر، کینسر سے محفوظ رہنے کے لئے ہدایات پر، بچوں کی تعلیم پر لیکچر دیئے جا سکتے ہیں۔ اگر معاملہ خواتین کا ہو تو امور خانہ داری پر کوئی خاتون مفید معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ خواتین کے موضوعات بھی باورچی خانے سے بیوٹی پارلر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلام کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنا چاہتے ہیں وہ اپنی سوسائٹی مسجد ہی میں قائم کر سکتے ہیں۔ علامہ پرویز کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کو

پڑھتے وقت اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا چاہیے، مثلاً ہم اردو میں کہتے ہیں ہوا و ہوس الھوا کے عربی زبان میں استعمال کو اس پتھر سے تشبیہ دی جاتی ہے جو ڈھلان سے لڑھک رہا ہو۔ جوں جوں وہ آگے جاتا ہے اسکی رفتار بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر انسانی زندگی میں اس تصور کی مجسم تصویر دیکھنی ہو تو اسے انگریزی ناول ''ڈاکر جیکل اینڈ مسٹر ہائیڈ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ بیٹی! ان نوجوانوں میں سے ایک نے وہ ناول پڑھا ہوا تھا۔ وہ پھڑک اٹھا۔ اسے دیکھ کر دوسرے نوجوانوں کی آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہو گئی۔ ہاں تو میں ان نوجوانوں سے یہ کہہ رہا تھا کہ اسی قسم کا متجسس رویہ عام نمازوں میں اگر جاری ہو جائے تو مسلمانوں کی زندگی میں بہت جلد انقلاب آجائیگا اور میرا پختہ ایمان ہے کہ انقلاب جب بھی اٹھے گا مساجد سے اٹھے گا۔ اسلئے ضروری ہے کہ امام مسجد نہایت تعلیم یافتہ ہو اور اسے حالات حاضرہ کے متعلق اچھی خاصی واقفیت ہو۔

عالم آرا: ابو! کیا مذہبی پیشوائیت آپ کو وہ انقلاب لانے دے گی جس کی تمنا آپ کر رہے ہیں؟

کلیم الزماں: بیٹی! یہاں میرا ذکر کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ انقلاب جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک صدی کے بعد آئے لیکن آئیگا ضرور اور وہ بھی پڑھی لکھی نسل کے ہاتھوں جو پیشہ ور ملا نہیں ہوں گے اور شاید وہ ظاہری شکل وشباہت کو بھی اہمیت نہیں دیں گے۔

جہاں آرا: ابو جی! روزوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

کلیم الزماں: بیٹی! روزوں کے متعلق میرا خیال یقیناً اس خیال سے مختلف ہے جو تمہارے سسرال میں ہے۔ زندگی میں کئی درشت مقام پیش آتے ہیں۔ کہیں بھوک اور پیاس ستاتی ہے لیکن غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ان سب حادثات اور واقعات کیلئے اپنے آپ کو تیار رکھنا اور ان کے بداثرات سے محفوظ رہنے کے لئے روزے بہترین ٹریننگ پروگرام مہیا کرتے ہیں۔ باقی رہے عوام، ان کو تو دلاسہ دیا جاتا ہے کہ اس ماہ صیام میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی مہینہ میں شیطان کھانے پینے کی اشیاء کی دکانوں میں پوری توانائی سے رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر چہ روزوں کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جذبات پر قابو پانا سیکھ لے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اسی مہینہ میں مسلمان کو غصہ بہت آتا ہے۔ روزوں کے مہینہ میں مسلمانوں میں اعتکاف میں بیٹھنے کی روایت بھی موجود ہے۔ جس کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ انسان مسجد میں بیٹھ کر یکسوئی سے اپنے حالات کے مطابق اپنے مسائل کو حل کرنے کا طریقہ قرآن مجید کی تعلیم کی روشنی میں سوچے لیکن ہوتا بالکل اس کے برعکس ہے، یعنی تراویح کے بعد مصلے پر بیٹھ گئے اور تسبیح ہاتھ میں لے کر اللہ اللہ کرنا شروع کر دیا یا کچھ دیر قرآن مجید کی ناظرہ تلاوت کر لی، اونگھ آگئی تو سو گئے۔ بھوک لگی تو کچھ کھا لیا، نماز کے وقت نماز پڑھی اور پھر عبادت کے لئے مصلے پر بیٹھ گئے۔ اور جب اعتکاف سے اٹھے تو ایک مبہم سی تسلی کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔ اعتکاف کے لفظ کا سلسلہ نسب اس سہ حرفی روٹ سے جڑتا ہے جس کا مطلب اس حالت کو بیان کرنا ہے جب عورت اپنے الجھے ہوئے بالوں کو کنگھی سے سلجھاتی ہے۔ لہذا اعتکاف کا مقصد یہ ہونا چاہیے

کہ انسان اپنی اپنی حالت میں اپنے معاملات کو سلجھانے کیلئے قرآن مجید کی تعلیم سے راہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ سیاستدان اپنی سطح پر سوچے، دکاندار اپنے حالات کے مطابق اور دہقان اپنے حالات کے مطابق اور عام انسان کے لئے یہ ہے کہ محلہ میں ہمسایوں کی اصلی یا مبہم بد سلوکی کی جوئیں اس کے دماغ کے بالوں میں پڑ گئی ہوں تو انہیں قرآن مجید کی کنگھی سے نکال باہر پھینکے تا کہ عید کی نماز کے بعد جب وہ اپنے ہمسایہ سے بغلگیر ہو تو یہ عمل ایک منافق کا عمل نہ ہو۔

عقیل الزماں: ابو! میں بہ صد احترام آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں وکلا کی سوسائٹی میں گھومتا پھرتا ہوں۔ عدالت ہی میں میرا سارا وقت انہیں سے باتیں کرتے ہی گزرتا ہے اور ہمارے اپنے گھر میں بھی وہی باتیں ہوا کرتی تھیں جو عوام میں ہوتی ہیں لیکن حج کرنے کے بعد آپکا نقطہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔

کلیم الزماں: بس چپ رہو۔ میں وہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ یہ بات حج کرنے کے بعد کی نہیں ہے۔ مجھ پر بڑی ہی ہلکی طاقت کی اس روشنی کی ایک لہر گری ہے جس نے نخل سینا کو بھسم کر دیا تھا اور یہ صدقہ ہے علامہ پرویز کی نگارشات کا اور علامہ اقبال کی شاعری کا جنہوں نے کہا تھا کہ ؎

حقیقت را بہ رندے فاش کردند
کہ ملا کم شناسد رمز دیں را

اب آخری بات رہ گئی قربانی اور حج کی۔ قربانی کی فرضیت تو پہلے ہی علما کے نزدیک زیر بحث ہے البتہ حج کو فرضیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ بڑا ہی نازک موضوع ہے۔ لوگوں کو اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ حج کے بعد انسان کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں اور وہ ایسا معصوم ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا۔ یعنی ملانے یا کسی اور نے مسلمان کو یہ دستاویز لکھ دی ہے کہ ساری عمر حرام زدگیاں کرو اور جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت آئے تو جھٹ سے حج کر ڈالو، میرے نزدیک حج کا جو مقصد ہے وہ عرب کی ملوکیت کو کبھی گوارا نہ ہوگا وہاں تو علامہ اقبال کے خیالات پر بھی قدغن ہے۔

اسلام کے دشمن

''اسلام کے دشمن دانستہ، اور نادان دوست نادانستہ، ٹھنڈے سانس بھر کر کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں قرآنی نظام ناقابلِ عمل ہے۔ تاریخ کے ایک دور میں تو اس نے شاندار نتائج پیدا کر دکھائے تھے۔ لیکن اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اب یہ ''چلا ہوا کارتوس'' کوئی نتیجہ مرتب نہیں کر سکتا۔ یہ آوازیں اِدھر اُدھر سے سنائی دے رہی ہیں اور عوام کے دلوں میں مایوسی پیدا کئے چلی جا رہی ہیں۔ آپ احباب کی ذمہ داری ہے کہ زمانہ کو بتا دیں کہ جو کچھ قرآن نے ایک دور میں کیا تھا اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے اور ہمیشہ اس کی صلاحیت رہے گی کہ ویسے ہی درخشندہ نتائج پھر مرتب کر دکھائے۔'' (طلوعِ اسلام کنونشن، 1959ء)

عقیل الزماں: ابو! آپ اپنی سکیم بتائیں۔ حج کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔

کلیم الزماں: بیٹا! یہ کوئی چیستان نہیں۔ آج کل کا تھوڑا بہت پڑھا لکھا انسان اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ انسانیت کی خیریت اسی میں ہے کہ قوموں کے درمیان پیار و محبت کا رشتہ قائم ہو اور اس پیار و محبت کے رشتے کی ابتداء دنیا میں پہلے ان اقوام میں شروع ہو جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں اور وہ اسی غرض سے سال میں ایک دفعہ طواف کعبہ کے لئے آتے ہیں، جسے حج کہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں حج کا اجتماع مسلم اقوام کی یو این او (UNO) ہونی چاہیے جہاں تمام اقوام کے نمائندے مل بیٹھ کر اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوششوں کے متعلق آپس میں مشورہ کریں، میں سمجھتا ہوں کہ اس سکیم کو مفید بنانے کے لئے مکہ یعنی بیت الحرم میں ایک حج ڈائریکٹریٹ قائم کی جائے اور چھوٹے پیمانے پر اسی قسم کی ڈائریکٹریٹ ہر اسلامی ملک میں وزارت خارجہ کا ایک حصہ ہو اور ان تمام ڈائریکٹریٹوں کا رابطہ مرکزی ڈائریکٹریٹ سے مسلسل قائم رہے اس رابطہ کے لئے آج دنیا میں انٹرنیٹ کا وسیلہ موجود ہے۔ جس کے ذریعہ مسلم ممالک ایک دوسرے کے معاشی، معاشرتی، سیاسی اور غیر سیاسی حالات سے ہر وقت آگاہ رہ سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے ملک کی صنعت اور تجارت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور انکے علمی کارناموں سے آگاہی ہو سکتی ہے اور مرکزی ڈائریکٹریٹ ہر قوم کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ اس موضوع کی تفاصیل کے لئے تو دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ مختصراً حج کے موقع پر ہر قوم اپنی کارکردگی پیش کرے جو مرکزی ڈائریکٹریٹ شائع کرے اور آئندہ کیلئے کوئی پروگرام وضع کر کے مسلم اقوام کو اس سے آگاہ کرے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہماری اپنی زندگی میں تو ایسا ہوتا نظر نہیں آتا، مجھے یقین ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ آج نہیں تو کل ضرور ہوگا کیونکہ قرآن مجید کا اس طرف اشارہ ہے کہ جب سمندر معمور ہو جائیں گے اور صحیفے اور رسل و رسائل زیادہ ہو جائیں گے تو زمین اللہ تعالیٰ کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ حالات تو پیدا ہو گئے ہیں لیکن یہ کب ہوگا اللہ ہی جانتا ہے۔ حج کا مقصد تو میں نے اپنی سمجھ کے مطابق بیان کر دیا ہے اور اس کی حقیقت کے مزید پہلو بھی ہو سکتے ہیں لیکن موجودہ زمانے میں مسلمانوں نے اس تقریب کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے گھناؤنے برتاؤ کا ارتکاب کیا ہے۔ منشیات کی سمگلنگ کے علاوہ سونے کی سمگلنگ کے لئے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ لطیفہ کے طور پر ایک حاجی کوفتہ کی کہانی بیان کی جاتی ہے کہ وہ جب حج کرنے کے بعد کراچی ایئرپورٹ پر آئے تو ان کے سامان میں ایک ہنڈیا بھی تھی جس میں نرگسی کوفتے تھے لیکن جب کسٹم والوں نے چیکنگ کے دوران ایک کوفتے کو توڑ کر دیکھا تو انڈے کی بجائے اس میں سے سونے کی ایک اینٹ نکلی۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا لیکن حاجی کوفتہ کی کہانی ہماری تاریخ کا حصہ بن گئی۔ اس ساری بحث کے بعد زکوۃ کا مسئلہ رہ جاتا ہے جو سب سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس پر آئندہ کسی وقت گفتگو کریں گے۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ **ادارہ طلوع اسلام** نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بجھوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۂ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

قرآنِ کریم کا اِنسائیکلوپیڈیا

قرآنِ مجید انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے لیکن اس کا انداز یہ نہیں کہ وہ ایک موضوع کے متعلق ایک ہی جگہ سب کچھ بیان کر دے۔ اس کے متعلق وہ مختلف مقامات پر تفصیلات دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے احکام و قوانین کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ ان کے متعلق اس نے کہاں کہاں، کیا کیا کہا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر ایسی وسیع نگاہ رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے اس مشکل کو ہمارے لئے حل کر دیا ہے۔ انہوں نے چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے قرآنِ مجید کا ایسا انسائیکلو پیڈیا مرتب کر دیا جس میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات میں سے ہر ایک کے متعلق قرآنی آیات کے حوالے دے دیئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے قرآنی تعلیمات کو (Classify) کر دیا۔

اس عظیم الشان علمی و تحقیقی کتاب

تبویب القرآن

کا نیا اور کمپیوٹر کمپوزڈ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج | طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ○ 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

قرآن مجید سمجھ کر پڑھنا چاہئے

لائبہ صبح کی نماز پڑھ کر ہمیشہ کی طرح قرآن مجید کھول کر بیٹھ گئی اور قرأت شروع کر دی۔ وہ روزانہ آدھا سپارہ صبح کے وقت پابندی سے پڑھتی۔ اس نے چھ سال کی عمر ہی میں سارا قرآن پڑھ لیا تھا۔ اب وہ بارہ برس کی تھی۔ وہ اس دوران میں کئی دفعہ قرآن کو ختم کر چکی تھی اس لئے اب اسے قرآن پڑھنے پر بڑا عبور حاصل ہو گیا تھا۔ خدا نے اس کو آواز بھی بہت رسیلی عطا کی تھی اس لئے جب وہ قرأت کرتی تو گھر والوں کو بڑی خوشی ہوتی۔ اس کی امی ابا بڑے فخر سے اپنے عزیزوں اور ملنے والوں سے اس کی تلاوت کا ذکر کرتے اور سب جاننے والے اس کی تعریف کرتے۔

لائبہ کو یہی بتایا گیا تھا کہ قرآن پڑھنے سے بڑا ثواب ہوتا ہے۔ جتنی دفعہ اسے ختم کرو گی اس سے دگنا ثواب پاؤ گی۔ چنانچہ لائبہ باقاعدگی کے ساتھ قرآن پڑھتی رہتی۔ آج جب وہ تلاوت کر رہی تھی تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی امی نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے لائبہ کے ماموں مدثر کھڑے تھے جو ایک عرصے سے سعودی عرب میں رہتے تھے اور اب اچانک آ گئے تھے۔ ظاہر ہے اس سے سب کو بڑی خوشی ہوئی۔ ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ انہی باتوں میں لائبہ کی تلاوت کا بھی ذکر آ گیا۔

ماموں جان نے کہا:

''ہاں میں نے بھی دروازے سے باہر قرآن پڑھنے کی آواز سنی تھی۔ ماشاء اللہ! لائبہ بیٹی کو قرآن مجید بڑی اچھی طرح پڑھنا آتا ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ لیکن بیٹی! یہ تو بتاؤ تمہیں قرآن کی آیات کا مطلب بھی سمجھ میں آتا ہے۔ ظاہر ہے روز پڑھتی ہو تو سمجھ کر ہی پڑھتی ہو گی۔''

ماموں کے اس سوال پر لائبہ نے پہلے تو ایک منٹ سوچا۔ پھر بولی:

''ماموں جان! مجھے قرآن پڑھنا آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے نا! اس کے مطلب کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتی۔''

لائبہ کے اس جواب پر اس کے ماموں کہنے لگے:

''اچھا ایک بات بتاؤ بیٹی! کیا تم نے قرآن کے علاوہ کبھی کوئی ایسی کتاب پڑھی ہے جس کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہ آتا ہو اور تم بغیر سمجھے اسے پڑھتی چلی جاؤ۔''

لائبہ نے جلدی سے کہا:

''نہیں ماموں جان! کتابیں تو ہم جو بھی پڑھتے ہیں، چاہے وہ اردو کی ہوں یا انگریزی کی یا کسی اور زبان کی، سب سمجھ کر ہی پڑھتے ہیں کیونکہ بغیر سمجھے کتاب پڑھنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہوتا۔''

''شاباش! لائبہ بیٹی!'' ماموں جان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ کسی کتاب کو بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ بتاؤ کہ کیا یہ کتاب جسے قرآن کہتے ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جو سب کتابوں کی سردار اور رہنما ہے، کیا یہ بغیر سمجھے پڑھی جائے گی؟ تم خود ہی سوچو۔ اس طرح اسے بغیر سمجھے، اس کے متعلق بغیر کچھ جانے پڑھتے چلے جانے سے تمہیں یا کسی اور کو کیا فائدہ ہوگا؟ چاہے تم اسے ہزار بار پڑھ جاؤ اگر تمہیں یہ ہی معلوم نہ ہو کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے جنہیں تم پڑھتی رہتی ہو تو محض الفاظ کو دہراتے رہنے سے کیا حاصل ہوسکتا ہے؟''

لائبہ بڑی ذہین بچی ہے۔ ماموں جان کی اس بات کو سمجھ گئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی:

''آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے الفاظ دہراتے رہنے سے ہم اس کا مطلب تو نہیں سمجھ سکتے پھر ہمیں کیا حاصل ہوسکتا ہے؟''

''ہاں بیٹی! یہی وجہ ہے کہ ساری عمر قرآن پڑھتے رہنے کے باوجود ہم اس کی نعمتوں سے محروم رہتے ہیں کیونکہ ہم قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔''

ماموں جان کی ان باتوں نے لائبہ کے دل پر بہت اثر کیا۔ اس نے پوچھا: ''ماموں جان! اب آپ مجھے یہ بتایئے کہ میں قرآن سمجھنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کروں۔''

انہوں نے کہا: ''اس کے لئے تمہیں عربی زبان سیکھنا ہوگی۔ جس طرح تم اردو اور انگریزی پڑھتی ہو بالکل اسی طرح عربی زبان پڑھنا شروع کردو۔ کچھ عرصہ کی محنت سے تم عربی زبان سمجھنے لگ جاؤ گی اور رفتہ رفتہ اس قابل ہوجاؤ گی کہ قرآن شریف کی آیات کو سمجھ سکو۔

پیاری بیٹی! یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف اپنے بندوں کو اس لئے دیا ہے کہ وہ اسے سمجھ سمجھ کر پڑھیں۔ بے سمجھے نہ پڑھا کریں۔ سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ اس کی بتائی ہوئی آیتوں کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔''

ڈاکٹر شاکر حسین خان
ورٹنگ فیکلٹی ممبر شعبہ علومِ اسلامی جامعہ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

''اُسوَۃٌ حَسَنَۃٌ'' کی قرآنی تفسیر

لفظ ''اُسوہ'' کا مادہ ''ا۔س۔و'' ہے۔ یہ ایک صفت اور عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنٰی، چال، ڈھنگ، نمونہ اور عمل کے ہیں۔(1)

امام راغب الاصفہانیؒ رقم طراز ہیں ''الأُسوۃ والأُسوۃُ کَالقِدوَۃِ وَالقُدوَۃِ وھیَ الحالۃُ التی یکونُ الِانسان عَلیھا فی اتبَاعِ غیرِہٖ اِن حَسناً وَاِن قَبِحاً وَاِن سارا وان ضَارًا''(2)

اسی بات کو (مولانا) عبدالرشید نعمانیؒ بغیر حوالے کے لکھتے ہیں ''غیر کی پیروی واتباع میں انسان جس حال پر رہتا ہے، اس کا نام اُسوہ ہے، خواہ وہ اچھی ہو بری، منفعت پہچانے والی ہو یا ضرر رساں''(3)

علامہ غلام احمد پرویزؒ اُسوہ کے معنٰی و مفہوم تحریر کرتے ہیں کہ ''اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں، وہ شے جس سے کوئی غمگین انسان، سکون اور تسلّی حاصل کرے اور چوں کہ اس قسم کی تسلّی بہترین طور پر کسی قابلِ تقلید نمونہ کو اپنے سامنے دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کے معنی نمونہ کے ہو گئے۔''(4)

نیز لکھتے ہیں ''جو شخص کسی نازک، خطرناک موقعہ پر عزم وثبات اور بلندیٔ سیرت کا ثبوت دیتا ہے، اس کا طرزِ عمل دوسروں کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسے ہی بنو۔''(5)

علامہ پرویزؒ رقم طراز ہیں ''نبی اکرم ﷺ کی ساری زندگی جس بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت کی مظہر تھی، وہ ہر اس انسان کے لیے جو سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی حاصل کرنا چاہے، بہترین نمونہ ہے۔ اس سیرت کے اصولی خط وخال خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔''(6)

علامہ پرویز رقم طراز ہیں ''کسی کا کوئی عمل جو قرآن کریم کے مطابق ہو، دوسروں کے لیے واجب التقلید نمونہ

---

(1) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، قاموس القرآن، کراچی، دارالاشاعت، اپریل 2011ء، ص:60، (2) امام راغب الاصفہانی، مفرادات الالفاظ القرآن، کراتشی، دارنشر اللغۃ العربیۃ، 2013ء، ص:26، (3) محمد عبدالرشید نعمانی، لغات القرآن، کراچی، مکتبہ دارالاشاعت، 1994ء، ج:1، ص:101 (4) پرویز، تبویب القرآن، لاہور، طلوع سلام، ایڈیشن ششم، 2015ء، ص:151، (5) پرویز، تبویب القرآن، لاہور، طلوع سلام، ایڈیشن ششم، 2015ء، ص:151-152، (6) پرویز، تبویب القرآن، لاہور، طلوع سلام، ایڈیشن ششم، 2015ء، ص:152

ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ تم ہمیشہ انصاف کے علمبردار بنو اور سچی شہادت دو خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ ایک شخص جانتا ہے کہ اگر میں نے سچی بات کہہ دی تو اس سے مجھے پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا پڑے گا لیکن وہ اس کے باوجود، سچی شہادت دیتا ہے اور پھانسی کا رسہ اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔ اس کا یہ عمل، دوسروں کے لیے مثال بن جاتا ہے، ایسے وقت میں ہر شخص یہ کہے گا کہ تمہیں اُس سچے اور بہادر انسان کو اپنے لیے نمونہ بنانا چاہیے۔ لفظی تلقین کے مقابلہ میں عملی نمونہ ہمیشہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اسے اندھی تقلید نہیں کہا جائے گا۔ جس سے قرآن کریم نے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ یہ حسنِ سیرت کا عملی نمونہ ہوگا۔'' (1)

اُسوہ، کا لفظ قرآن مجید میں تین مقامات پر آیا ہے۔ (محمد فواد عبدالباقی، المعجم المفهرس لالفاظ القرآنِ الكريم، المصر، منشورات ذوی القربیٰ، الطبعة الثانية، 1988ء، ص:43) جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ایک مرتبہ (33:21) میں، اور دو مرتبہ (6-60:4) میں آیا ہے۔ (33:21) میں، جناب رسول اللہ ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی بہترین مثال ہے اور (6-60:4)'' کی آیات میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے طرزِ زندگی کو ''اسوہ حسنہ'' قرار دیا گیا ہے۔

اللہ رب العلمین، نے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے طرزِ زندگی کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ (60:4)

ترجمہ ''بے شک تمہارے لیے اچھی مثال ہے ابراہیمؑ اور اُن میں جو اِن کے ساتھ تھے۔''

اسی سورہ کے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۭ (60:6)

ترجمہ: ''بے شک تم لوگوں کے لیے اُن میں ایک اعلیٰ مثال ہے اُن کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ اور آخرت کے دن کی۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام صرف ایک معبودِ حقیقی پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے اور اللہ رب العلمین کی نازل ہونے والی کتاب کے عامل تھے۔ ان کا طرز زندگی اللہ رب العلمین کی رضا اور خوشنودی کے مطابق تھا، وہ اللہ رب العلمین کے اطاعت گزار عبد تھے۔ ان کا عمل اللہ رب العلمین کے حکم کے مطابق ہوتا تھا۔ وہ اللہ رب العلمین کے عباد سے محبت کرتے اور دیگر مخلوقات پر بھی رحم کرتے تھے۔ وہ غرور و تکبر نہیں کرتے تھے اور ان کے ساتھی جو اللہ رب العلمین کے فرمانبردار تھے وہ سب ایک خدا، اللہ رب العلمین کو اور اس کی نازل کی ہوئی کتاب کو مانتے تھے۔

قرآن کریم نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین مکہ کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے جیسا کہ وہ لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہیں اللہ رب العلمین نے ان کی اس بات کو جھوٹ کا پلندا قرار دیا۔ اللہ رب العلمین کا فرمان ہے:

(1) پرویز، تبویب القرآن، لاہور، طلوع اسلام، ایڈیشن ششم 2015ء، ص:152

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ (3:68-67)

ترجمہ ''ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن حق پرست مسلم تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، بے شک سب سے زیادہ حق دار ابراہیمؑ کے وہ ہیں جنہوں نے اطاعت کی تھی اور یہ نبی اور جو ان (پر نازل ہونے والے کلام) کو مان گئے اور اللہ مؤمنوں کا ولی ہے''

اللہ رب العلمین نے جناب رسول اللہ ﷺ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے فرزندِ ارجمند سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں مبعوث فرمایا وہ اللہ رب العلمین کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تھے اور انہوں نے اللہ رب العلمین سے یہی دعا کی تھی کہ ہمارے بیٹوں اور ہماری ذرّیّت کو بھی بت پرستی سے محفوظ فرما، جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا:

وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾ (14:35)

ترجمہ ''اور بچا لے مجھے اور میرے بیٹوں کو بت پرستی سے۔''

اور اللہ رب العلمین کی بارگاہ میں یہ بھی دعا کی تھی کہ: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ﴿۴۰﴾ (14:40)

ترجمہ: ''اے میرے رب مجھ کو رکھ صلوٰۃ قائم کرنے والا اور میری ذرّیّت سے بھی۔''

اور جب اللہ رب العلمین کے یہ عباد الصالحین سیدنا ابراہیم و سیدنا اسمٰعیل علیہم السلام کعبۃ اللہ کی دیواریں بلند کر رہے تھے تو انہوں نے اپنے رب کے حضور یہ دعا کی تھی کہ:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ (2:128)

ترجمہ ''اے ہمارے رب بنا دے ہمیں اپنا فرمانبردار اور ہماری ذرّیّت سے ایک جماعت فرمانبرداروں کی۔''

پھر انہوں نے اپنی ذرّیّت کے لیے یہ دعا کی: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ (2:129)

ترجمہ: ''اے ہمارے رب بھیج دے ان میں انہی میں سے رسول، جو ان پر تلاوت کرے تیری آیات اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔''

سیدنا ابراہیم و دیگر انبیاء کرام علیہم السلام نے ہمیشہ اپنی ذرّیّت (اولاد اور اپنے ساتھیوں) کو اللہ رب العلمین کے دین پر قائم رہنے کی وصیت کی جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا: وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (2:132)

ترجمہ: ''اور وصیت کی (اسی فرمانبرداری کی) اپنے (اور اپنی قوم کے) بیٹوں کو ابرہیم نے اور یعقوب نے، اے بچو! بے شک اللہ نے چن لیا تمہارے بھلے کے لیے دین کو، تو ہرگز نہ مرنا مگر (اللہ کے) فرمابردار ہو کر۔''

جیسا کہ تاریخی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کو مکۃ المکرمہ (امّ القریٰ/ بکہ) میں بسایا۔ سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کو قیام پذیر دیکھ کر دور دراز کے لوگ بھی مکۃ المکرمہ میں آباد ہو گئے۔ اولادِ اسمٰعیل، مکۃ المکرمہ میں پھولی پھلی۔ اور ان ہی کی پشت سے نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ کو تشریف لانا تھا۔ اس لیے وہ بت پرستی کی برائی سے محفوظ رہی یہی لوگ سیدنا ابراہیم و سیدنا اسمٰعیل علیہم السلام کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا رہے۔ یہی اسوہ حسنہ، دین حنیف ہے۔ وہ اسی دین کے علم بردار رہے۔ ان کے لیے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ رب العٰلمین سے دعائے مغفرت کی جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا: رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ (14:41)

ترجمہ ''اے ہمارے رب مغفرت فرما میری اور میرے والدین کی اور فرمانبرداروں کی جس دن قائم ہو حساب''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والے دین حنیف پر کاربند رہے اُن ہی کے لیے اللہ رب العٰلمین نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰھِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ وَھٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (3:68)

ترجمہ ''بے شک سب سے زیادہ حق دار ابراہیمؑ کے وہ ہیں جنہوں نے ان کی اتباع کی تھی اور یہ نبی (محمد رسول اللہ) اور وہ جو ان کو مان گئے۔''

چناں چہ اللہ رب العٰلمین کے آخری نبی، محمد رسول اللہ ﷺ دین ابراہیم کے حقیقی علم بردار ہیں۔ اس لیے ان کی پیروی بھی اُسوۃ حسنہ ہے۔ یہی دین اسلام ہے۔ یہی دینِ ابراہیمی ہے۔ جناب محمد رسول اللہ ﷺ اس دین کے داعی بن کر دنیا میں تشریف لائے۔ اللہ رب العٰلمین نے ہمیں اُن کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہوا: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ﴿۲۱﴾ (33:21)

ترجمہ ''بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول کا کردار ایک اعلیٰ مثال ہے تم میں سے اُن کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ اور آخرت کے دن کی اور کثرت سے یاد دہانی کرتا ہے (کتاب پڑھتا ہے) اللہ کی'' چناں چہ یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ایک الٰہ پر ایمان رکھنا اُسوہ حسنہ کی اساس ہے، اُسوہ حسنہ کی قرآنی تفسیر اور تمام انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا خلاصہ یہی ہے کہ ایک خدا اور یوم آخرت پر یقین رکھا جائے اور اُن پر نازل ہونے والی کتاب کے مطابق عمل کیا جائے۔ سیدنا ابراہیمؑ اور رسول اللہ ﷺ کی بھی یہی تعلیمات ہیں اور دین اسلام بھی ہم سے اسی کا متقاضی ہے۔ اللہ رب العٰلمین نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا جو حکم دیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ جو اِن پر نازل ہوا ہے اس کی اتباع کی جائے۔

اس مقام پر یہ بات بھی ضمناً عرض کر دوں کہ ''محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھی محمد رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے کی وجہ سے صحابی کے مرتبے پر فائز ہوئے انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کو جس طرح الکتاب کا عامل پایا اسی طرح انہوں نے بھی الکتاب کی اتباع کی اس لیے اُن کا عمل بھی اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہوا۔

□□□□

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

Chapter 2: Life's Essence (*Khum-e Zindagi* - خم زندگی) –

Message to Fellow-Seekers

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1957)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Episode No.3

Opposition since last year

This is what the enemies of Tulu-e-Islam decided to do last year. It has been brought to my attention by different Bazms that they have come to Tulu-e-Islam posing as friends and well-wishers but their intention is to harm this movement from inside. You all know that we have nothing hidden that they want to steal it. Everything we do and write is out into the open. We are not concerned about them stealing our secrets because we *have* no secrets. So, what are they here for? Why have they joined you? Well, they want to create internal chaos in our collective peace. They want to sow the seeds of doubts and suspicions among us. They want to entangle you in abstract discussions. They want to engage in religious debates and trivial hairsplitting so that you cannot focus on your programs and actions. They try their best that this organized effort somehow acquires the form of a party. This they do within this movement. But when they go outside they engage in distortion and propaganda against Tulu-e-Islam's teachings, its message and its thought. People believe their maleficence because they think that they are inside members of the Tulu-e-Islam family. This is the biggest harm that comes to Tulu-e-Islam from such people.

Ignorant friends

That is one group that comes to Tulu-e-Islam with the intention of purposefully harming it. But a bigger threat comes to it from its naïve friends who have good intentions but get easily carried away by such propaganda and become tools in the hands of the first group. You can investigate and single out those enemies who deliberately join Tulu-e-Islam in order to harm it; but what can you say about its ignorant friends who become tools of destruction in the hands of the scheming ones?

A revolutionary movement – whose mission is to bring about change in people's thoughts and minds – needs to be extra careful in the initial phase of the call from such a danger. The Quran has suggested تعوذ (*Ta'oodh*) for such a situation: قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ (113:1) – The stage which this revolution is now entering is likely to produce a clash with the opposing forces. You thus have to be very careful: Just like how a new-born baby needs its mother's company for protection, you should tell your followers that they should take refuge under Allah's universal system of sustenance, whose Law of creation and evolution stipulates that something new always results from the clash of positive (constructive) and destructive forces. When the seed bursts then the plant emerges. قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) – To achieve the objective mentioned above we should come closer to the Divine Law which provides for the nourishment of the whole of humanity (and not of a particular group of people or tribe). He is the

Sustainer of the whole world (1:1). Did you notice my friends what prescription the Quran prescribes to protect a new-born movement from dangers lurking in the shadows? It tells its sincere members of the movement to remain close to the center of its thought and system. In case of any danger they should immediately come under the protection of the center; and refer any issue to the center for receiving advice and guidance.

Remedy

This is explained in Surah Al-Nisa thus: وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ ؕ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا (4:83) – These people are not habituated to a disciplined life. Whenever they hear any news of peace or danger they broadcast it directly. Had they brought the news to the notice of the Prophet (PBUH) or the local authority, those who have been charged with the responsibility of scrutinizing news would have found out the truth. Were it not for Allah's goodness towards you, the majority amongst you would have followed the Devil.

Keeping the above critical instruction of the Quran regarding this issue in mind, I have decided to lay down a framework of guidance and a code of conduct for Bazm members; so that sincere fellow-travelers accompanying us on this journey may be able to get proper direction. These instructions will serve as constitution and bylaws for all the Bazms. I request you to please go through this document of guidance carefully. Those who agree with this guidance they should consider themselves as members of Tulu-e-Islam. Those who disagree with it and think that this unduly constrains their activities should find a different outlet for their activities. Tulu-e-Islam does not have monopoly on Quranic thought and actions. Those who have the passion and the energy for this work they can find whatever channel is suitable to them for realizing their goals and ambitions. But you will agree with me that, for anyone who wants to remain associated with Tulu-e-Islam, it is necessary that he/she must abide by its code of conduct and guidance. It will not be acceptable that one remains associated with Tulu-e-Islam and engages in ideologies and activities contrary to its code of conduct and its guidelines.

***

My dear brothers, whatever I had to say I have said it. I am thankful to you that you have attentively listened to my request with deep interest and great passion. In the end I want to express my heart-felt thanks to Allah for providing me with sincere friends like you. It is a fact that, in the journey of life, having a true friend lessens the difficulties of the way and brings the destination closer and closer. Your friendship, if I recall these past years, has made my desires younger; my courage loftier; my intentions stronger; my life full of beautiful spring; and my dying worthwhile. I feel Allah has done favor and says:– Be Alive with full spirit! Who knows my ideas – which I thought were no more than lovely fragrant dreams of shining silent stories of my deep imaginations – could turn into the form of a beautiful fully alive new world? *This* is the new world that Adam has been searching for millennia ever since he was

kicked out of heaven – and finds shelter nowhere. This is the lost paradise which is the pinnacle of his desires; the final destination of his hopes; and final hope of his life. This is the heavenly earth on whose gate is written in shining white moonlight color: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا (3:97) – whoever enters this gate, would get complete peace and security.

Think my dear brothers! If by your struggle; if by your passion and drive; if by your warmth and love for humanity; if by your crying at night and rising in the early morning – the gates of this earthly heaven for humanity opens up and the atmosphere starts echoing with songs of …

Adam has risen and a revolution has happened;
In front of fistful of dust stars have bowed down!

…

Then what could be better than this for humanity's shining destiny. O caravan of passion! O travelers marching towards the destination of love! Move forward because the world is waiting and singing:

Bring on the revolution, bring the mirror shining;
We are eyeing at you with great promise longing!

May Allah's cosmic forces be with you and help you in this mission: اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ (41:30-32) – People who proclaim that Allah alone is their Sustainer and remain firm and steadfast in their commitment so much so that no power on earth can influence them otherwise, then the heavenly forces will descend upon them and strengthen them further. They will say, "Have no fear, apprehension or grief; but rejoice and receive the happy news of the blissful life of heavenly society that has been promised to you." We are your close friends in this life; and we will be your close friends in the hereafter. You will therefore enjoy this blissful life in this world as well as in the life to come. In this blissful happy life you will get whatever you desire or ask for." Whatever you desire will happen and whatever you want will be provided. This will be the result of your unshakable faith and continuous work! All this will be provided to them with due grace and dignity, like the way a host caters to his guests. This will include provisions from Almighty which will protect them from all dangers; and will also contain means of their nurturing development.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

We are also Muslims like other Muslims

(Explanatory Remarks, Tulu-e-Islam Convention, November, 1956)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

My dear friends, this convention has been going well according to the formal program agenda for the past three days. But now I want to talk about some issues as a family by setting aside the formalities of the program. Time is short and a whole world of possibilities is calling on us. And I want to say something very important at this point.

I have been hearing some people declare that I became Muslim last year; that I became Muslim three years ago, etc. I know what they really want to say but the words they are choosing to express that are quite inappropriate. In fact, these words are misleading. Let me point out that we were Muslims before and we are Muslims now – the same kind of Muslims as other Muslims of the milieu, except that we want to understand the real framework of the دین (*Deen*) that Allah sent to humanity; and we want to know how it can be practically implemented in this piece of land. So, we cannot be different from other Muslims or consider ourselves in anyway superior to the rest of the Muslims. As for the meaning of the claim that "we have been Muslims for so many years …" – even this is not right because to be a Muslim is no child's play. As Allama Iqbal says:

It's to step in a witness stand of conviction;
People think it is easy to become a Muslim!

Another place he says:

Whenever I say I am Muslim, I tremble;
As I know the difficulties of "La Ilah"!

So, please tell me who it is among us who could really claim to be a Muslim in the true sense of its meaning? On the other hand, it is my claim that if only few of you who are present here could become true Muslims then there will be revolution in the world order.

Can anyone imagine the immense power of Momin?
Destinies get transformed by the glance of Momin!

Please ponder my friends! If that were the case then: would any of these issues and problems that we are facing today will remain? The Quran goes so far as to say that if you are a Muslim then you can surpass the limits of the Earth and the planets. If we had really and truly become Muslims for three years then

the destiny of the world would have changed. Therefore, we should not make a claim which is not supported by our character and deed. This is very serious.

Importance of prayer

I have also heard some members say that there is no need of prayers now that we have understood Islam. I want to ask such members: This is what Tulu-e-Islam has taught you that you should feel proud for not performing prayers? You continue to live non-Quran life and you are engaged in non-Islamic habits but you are prompted to talk like this now? And the irony is that you are engaged in such talks expressly by associating yourselves with Tulu-e-Islam. How great an allegation is this that you have leveled against Tulu-e-Islam?

I myself have personal weaknesses that I always admit. But it is extremely wrong to find excuses for one's own weaknesses and shortcomings. You are doing everything against the Quranic values and guidelines? Business, trade, banking, marriage, parties, and relationships – everything is going on? You didn't think of bringing them into line with the Quran? Then why is such talk when it comes to prayer? We can reform society only by starting it from within our own homes. But if we abandon our prayers and fasts then how will reformation take place? For God's sake please keep your words and deeds based on knowledge and sincerity. Do not look for "sacred" excuses. Instead, admit your weaknesses and shortcomings. We have to establish a Quranic society which can only be possible to do by leading an honest and sincere life.

However, you can say that we have understood the concept of دین (*Deen*) in *such and such* way; and that when it gets established practically then things will be done in *such and such* way. But you can start doing many things right now, e.g., fulfilling promises, speaking truth, not deceiving, etc. You don't need to wait for the دین (*Deen*) to be established for these?

When things reached my attention I had to clarify the reality of the situation.

Wrong methods

I do not want to say anything about your resolutions. But I do want to say that I have lit a small lamp with my blood and my wish is that it continues to remain lit while it moves forward. But it won't simply be lit by money because the oil that illuminates it comes from deep inside the heart and is more valuable than any (yellow, white or black) gold. To keep it illuminated requires flames of inner fire. There is no doubt that money is indispensable to propagate any thought, but money is not everything. In the words of Allama Iqbal:

The reason is something else, which you know that yourself;
The downfall of Muslim society is not due to lack of wealth!

Do not even think of using any wrong means in this sacred work? Please note that even one wrong step destroys everything in the path of حق (*Haq* or Truth). This lamp which illuminates the earth and the heavens – نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ – cannot be lit by wrong means. Every member of our movement should be such that, by looking at him from afar, people can say that here comes a living example of Quranic thought. When the Prophet (PBUH) was asked about the truthfulness of his mission then he simply replied: فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10:16) – I have dwelt amongst you all my life before (this revelation came to me). Can't you understand this much? Please remember this: To tread on the Quranic path among the crowd of enemies is a tall claim. This difficult journey can't be covered with external resources. The seeds of our movement will sprout from the depth of our hearts; and their rise and growth will tell everyone what the universal system of sustenance is? Propagating the literature alone will also not be able to achieve anything. Adam was told: وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (2:36) – and on earth you shall have your abode and your livelihood for a while [Asad]. The Earth provides support for our subsistence. We will definitely make use of its resources. But this support should be like the water that supports a ship. But the same water if it goes inside the ship during storm – then you know what happens to the ship? Therefore, do not let material supports overwhelm the ship of your struggle and travails. Keep these material supports under check of the power of your Iman. To bring about Quranic revolution in front of the world use honesty, steadfast determination, fortitude, sincerity, patience, and perseverance. And have 100% conviction in the Quranic mission.

Lot of propaganda is being directed against this movement. Many false rumors are being circulated against you. But you prove by your actions that you are neither a religious sect nor a political party. We are also aboard the Millat's ship together with others. If God forbid, this ship were to go down we will also drown along with others.

It is our good fortune that we got a piece of land for the establishment of the Quranic system. The association of Tulu-e-Islam with the Pakistan movement was precisely because of this: that it is not possible to establish the دین (*Deen*) without having a piece of land. Now that we have got that piece of land, all our struggles must be so that that دین (*Deen*) gets established here. From your side nothing whatsoever should happen that might be detrimental in any way to this land called Pakistan. To defend this land is your first and the foremost duty no matter even if you have to put your life on the line in order to do that.

O Almighty, the Creator of the Universe, O Allah! We have come to you with our utmost sincere and true feelings for understanding your Book and to follow it and to try our best to establish it.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
8

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

